چائنا میرے آگے

تالیف

محمد سمعان خلیفہ ندوی

ناشر

معہد امام حسن البنا شہید۔بھٹکل

سلسلۂ اشاعت نمبر (۳۸)

نام کتاب : چائنا میرے آگے

تصنیف : محمد سمعان خلیفہ ندوی

صفحات : ۱۰۴

قیمت : ۱۰۰ روپئے

تعداد : ۱۰۰۰

ملنے کے پتے : مولانا ابوالحسن ندوی اسلامک اکیڈمی۔بھٹکل
پوسٹ بکس نمبر ۳۰۔کرناٹک
مکتبۃ الشباب العلمیۃ۔ندوہ روڈ۔لکھنؤ

Published in 2015

ناشر

معہد امام حسن البنا شہید

پوسٹ بکس نمبر ۱۳، بھٹکل 581320 کرناٹک

فہرستِ مضامین

انتساب

راہِ وفا کے راہیوں اور دینِ اسلام کے شیدائیوں کے نام:

جنھوں نے صرصر وسموم کے رقص میں بھی شمعِ ایمان کو فروزاں رکھا ہے اور پیمانِ وفا کو سینے سے لگا رکھا ہے؛

کیا عجب کہ ان کی دعوتی کارگزاری کا ذکرِ جمیل سالکینِ راہ کے لیے مشعلِ نور بن جائے۔

اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی
ہم نے تو دل جلا کے سرِ عام رکھ دیا

☆☆☆

اور محفلِ شعر وادب کے باذوق رفیقوں کے نام:

جن کی تحریک اور تشویق اس بے بضاعت کو حوصلہ بخشتی رہی، تو لیجیے:

پھول کچھ میں نے چنے ہیں ان کے دامن کے لیے

عرضِ ناشر

دورانِ طالب علمی میں یہ حدیث پڑھی تھی کہ ''اطلبوا العلم ولو کان بالصین''، یعنی علم حاصل کرو چاہے اس کے لیے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے؛ اس زمانے میں چین کا سفر کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تصور کیا جاتا تھا؛ نہایت ہی دور دراز کا سفر، مشقت اور تھکاوٹ کا سفر؛ مذکورہ حدیث سے یہ بتانا اصل مقصود ہے کہ علم کے حصول کے لیے چاہے جتنے جتن اختیار کرنے پڑیں، مجاہدے اور محنتیں کرنی پڑیں کیا جائے، یہ اس وقت کی بات تھی جب تیز رفتار سواریاں ایجاد نہیں ہوئی تھیں، لوگ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر جانوروں کی پیٹھوں پر اور پانی کے جہازوں پر سفر کرتے تھے اور قرآن کی زبان میں ﴿لم تکونوا بالغیه الا بشق الأنفس﴾، ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے میں مشقتیں برداشت کرنی پڑتیں تب جا کر آدمی اپنی منزل مقصود تک پہنچتا تھا اور اس کے لیے ہفتوں اور مہینوں لگ جاتے۔ موجودہ زمانے میں تو سفر بہت ہی آسان ہو گیا ہے، وہی سفر اب گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے، پھر بھی سفر سفر ہی ہوتا ہے، زمانے کی ہزار ترقیات اور آرام دہ سواریوں کے باوجود سفر میں تکلیف اور مشقت سے واسطہ پڑتا ہی ہے، اسی لیے آں حضور (ﷺ) نے سفر کو ''قطعة من العذاب'' یعنی تکالیف کا مجموعہ بالفاظ دیگر نمونۂ سقر فرمایا ہے، مگر ساتھ ہی یہ وسیلۂ ظفر بھی ہے۔

چین کا نام زبان پر آتے ہی ''دیوارِ چین'' ذہنوں میں گردش کرنے لگتی ہے؛ پرانے زمانے میں بادشاہ اپنے ملکوں کو دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے لمبی لمبی فصیلیں تعمیر کیا کرتے تھے، یہ لمبی اور اونچی دیواریں ہوا کرتی تھیں، یہ دیوارِ چین بھی اسی کا ایک نمونہ ہے، یہ طویل بھی ہے اور عریض بھی، اس کا طول ۱۴/۱۵ ہزار میل بتایا جاتا ہے، اس کی تعمیر پر ایک زمانہ بیت گیا، اب یہ بہت پرانی ہونے کی وجہ سے اپنی خستہ حالی اور بوسیدگی کی داستان سنا رہی ہے اور زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ ''ہر عروج را زوال است'' یعنی ہر عروج کا زوال ہے؛ گویا کہ اب یہ دیوار ''دیوارِ گریہ'' بن چکی ہے۔

ملکِ چین میں مسلمانوں کی بہت آبادی ہے، کروڑوں کی تعداد میں مسلمان وہاں بستے ہیں، یہاں اسلام حضرت عثمانؓ کے زمانۂ خلافت میں بعض مبلغین کے ذریعے پہنچا، بعض کا یہ کہنا

ہے کہ وہاں حضرت ابو وقاصؓ نامی صحابی کا مزار بھی ہے۔

ادھر پانچ ماہ قبل جامعہ اسلامیہ کے تین ہونہار ذی علم سپوت؛ مولانا فیصل احمد ندوی، مولانا ڈاکٹر عبدالحمید اطہر ندوی، مولانا سمعان خلیفہ ندوی نے چین کا سفر کیا، کئی دن وہاں قیام کیا، بہت سی چیزیں وہاں دیکھیں، وہاں کے دل کش قدرتی مناظر، عجائباتِ قدرت، مساجد اور تعلیمی مراکز کا دورہ کیا اور احباب و متعلقین، اہل علم و اہل دانش سے ملاقاتیں کیں اور وطن واپس آئے، جامعہ اسلامیہ کے وسیع وعریض ہال میں اساتذہ وطلبہ کے درمیان اپنے سفر چین کی روداد مدلل و مفصل سنائی، اس روداد کو احقر کے کہنے پر مولانا سمعان خلیفہ ندوی نے حوالۂ قرطاس کیا، بڑے اچھے اور البیلے انداز میں اور ادبی اسلوب میں تحریر کیا ہے، موصوف اردو ادب کا اچھا اور ستھرا ذوق رکھتے ہیں، تحریر کا سلیقہ بھی پایا ہے، ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آکر مقبولِ عام وخاص ہو چکی ہیں، موصوف کی ایک کتاب بنام ''خواتین کے لیے رہنما اصول'' معہد امام حسن البناء الشہید سے شائع ہو چکی ہے، اب ان کی یہ دوسری کتاب ''چائنا میرے آگے'' (سفرنامۂ چین : مشاہدات وتاثرات) بھی معہد اپنے صرفے سے چھپوا کر اردو ادب کی ایک حقیر سی خدمت انجام دے رہا ہے؛ اللہ تعالیٰ اس کو شرف قبولیت بخشے، آمین۔ اس کتاب کی قیمت اور وزن حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے مقدمے اور مولانا عمیر الصدیق ندوی کے تاثرات کی وجہ سے بڑھ گیا ہے؛ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو اپنے شایانِ شان جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

سفر کی روداد یا اس کے تاثرات نثر یا نظم میں قلم بند کرنے کا سلسلہ ایک زمانے سے چلا آرہا ہے، جس کی وجہ سے اردو ادب میں ایک اچھا خاصا ذخیرہ تیار ہو گیا ہے، مولانا موصوف نے بھی ادب کے ان شہ پاروں میں ایک اچھا اور عمدہ اضافہ کیا ہے، اور یہ موضوع بھی بڑا دل چسپ اور دل نشین ہوتا ہے، اس کے مطالعہ سے لطف و چاشنی ملتی ہے، بوریت ذرا بھی محسوس نہیں ہوتی۔

زیر نظر کتاب کے مطالعہ سے بھی آپ ایسا ہی محسوس کریں گے اور اس سے آپ اپنے علم ومعلومات میں اضافہ پائیں گے۔

محمد ناصر سعید اکرمی

بانی وناظم معہد امام حسن البنا شہید، بھٹکل

۹/ جمادیٰ الاولیٰ ۱۴۳۶ھ مطابق یکم مارچ ۲۰۱۵ء

عرضِ حال

الحمد لله الذي بنعمته تتمّ الصالحات، وله الحمد أولاً وآخراً۔

''چائنا میرے آگے'' اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے؛ یہ ایک علمی سفر کی داستان ہے، جو خاکِ چین میں پنہاں ایمانی ذرّات کی کھوج کے لیے کیا گیا؛ یہ ایک دعوتی سفر کی کارگذاری ہے جو چین کے کہساروں میں دعوت کے امکانات کو تلاش کرنے کے لیے کیا گیا؛ یہ ایک خیر سگالی دورے کی روداد ہے، جو اسلامیانِ چین کی محبت میں ان کے حالات کو جاننے، ان کی سرگرمیوں کو قریب سے دیکھنے، ان کے کوائف و مسائل سے واقف ہونے اور ان کے درد کو سمیٹ کر' امّت مسلمہ کی فکر مند روحوں کی فکرمندی اور ملت کی صلاح وفلاح کے لیے تڑپنے والے بے چین دلوں کی بے چینی کی نذر کرنے کے لیے کیا گیا۔ مگر ساتھ ہی امت کی زبوں حالی اور نظمِ ملت کی ابتری پر کچھ آنسو بھی بہائے گئے ہیں؛ اس لیے یہ داستانِ غم بھی ہے' رودادِ الم بھی، البتہ امتِ مسلمہ کے روشن مستقبل کی آہٹ بھی یورشِ آفات میں سنائی دیتی ہے؛ کیوں کہ راہِ وفا کے راہیوں اور دین وملت کے فدائیوں نے اپنا تن من دھن وار کر، حکمت وبصیرت کی زرہ اوڑھ کر' حالات سے نبرد آزمائی کرتے ہوئے' اور آندھیوں کے جھکڑوں میں بھی' شمعِ ایمان کی لَو بجھنے نہیں دی ہے اور قرآن کی روشنی کو سینے سے لگا رکھا ہے۔

چین کا سفر ہو اور دیوارِ چین کی زیارت نہ ہو' کچھ عجیب سا لگتا ہے، مگر مقصد کی بلندی پیش نظر ہو تو بڑی سے بڑی مادّی خواہشوں کو بھی قربان کرنا آسان ہو جاتا ہے، ظاہر ہے ہمارا مقصد سیاحت نہیں تھا؛ اس لیے ہم نے اس سفر میں اس طرف توجہ نہ دی اور اس کو کسی اور وقت کے لیے ٹال دیا۔

ستمبر کے اواخر میں کیے جانے والے اس سفر کے رفقاء میں جواں سال، جواں عزم، مثالی تحقیقی ذوق کے حامل، اور ہر موضوع پر معلومات کا گنجینہ مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی (استاذ دار العلوم، ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ)، لائق وفائق، ہونہار وبلند کردار، سو سے زائد کتابوں کے مترجم اور محقق ڈاکٹر عبدالحمید اطہر بھٹکلی ندوی (استاذ ورکنِ شوریٰ جامعہ اسلامیہ۔ بھٹکل) اور یہ کم سواد تھا' جو اپنی بے بضاعتی کے باوجود متوقع فوائد کے پیشِ نظر اس قافلۂ علم ودعوت کے ہم رکاب ہو گیا؛ یہ اس بے بضاعت کی خوش

قسمتی ہے کہ قرعۂ فال اس کے نام بھی نکلا، ورنہ ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گل

''دنیا میرے آگے'' سے ''چائنا میرے آگے'' کا خیال مستعار لیا گیا ہے، اور چوں کہ یہ سفرِ چین کی پہلی قسط ہے جس میں چین کے بحرِ بے کراں کو محدود دریائے رواں سمجھنے کی بھول سفر سے قبل ہوئی اس لیے، اور کچھ تو اجنبیت اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے بھی اٹھارہ/۱۸ روز میں صرف ہنزو، شانگھائی، یِوُ- مشرقی چین- لانزو، لنشیا، شینگ، شی آن- وسطی چین- کا دورہ ممکن ہوا، اس لیے اس کی دوسری قسط میں ارادوں کا سفر (اگر نصیب نے یاوری کی تو) تبت- مغربی چین- سے شروع ہو کر یُونّان، کنمنگ، گوانزو- جنوبی چین- سے بیجنگ- شمال مشرق- ہوتے ہوئے داخلی منگولیا- شمالی چین- سے نکل کر تا بخاک کاشغر- شمال مغرب- پہنچ کر ختم ہوگا ان شاء اللہ، مگر ہنوز دلّی دور است؛ لیجیے سرِ دست ''چائنا میرے آگے'' اس سفرنامے کی پہلی قسط کے طور پر پیشِ خدمت ہے۔

اس موقع پر میں اپنے مربی اور ملت اسلامیہ ہندیہ کے قافلہ سالار حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کا بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ آپ نے قیمتی کلمات تحریر فرمائے؛ آپ کے بیش قیمت کلمات کتاب کا بیش قیمت حاصل ہیں، نیز میرے محسن اور کرم فرما جناب مولانا عمیر الصدیق دریابادی ندوی کا بھی تہہ دل سے مشکور ہوں کہ اپنی علمی مصروفیات سے کچھ وقت نکال کر آپ نے کتاب کو دیکھا اور بنظرِ استحسان دیکھا، اور اپنے دریابادی قلمِ گوہر رقم سے کتاب کی عزت اور راقم سطور کی ہمت بڑھائی، ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر عبدالحمید اطہر ندوی نے بھی اپنا تعاون پیش کیا، اسی طرح ناظم معہد حسن البنا شہیدؒ جناب مولانا ناصر اکرمی صاحب جامعی (جن کی مسلسل تحریک ہی- سفر سے قبل بھی، سفر کے بعد بھی- دراصل ان سطروں کا باعث بنی، ان کا) اور جملہ معاونین و محسنین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اللہ رب العزت سے دعا گو ہوں کہ اس کے فضل اور احسان سے اس سفرنامے کو آسمان پر قبولیت اور زمین پر مقبولیت کی خلعت عطا ہو، رضائے مولیٰ کی جستجو میں عمرِ عزیز کا لمحہ لمحہ بسر ہو، اور احیائے اسلام کے خواب آنکھوں میں سجا کر دنیا کے چپے چپے تک پہنچ کر حق کا پرچم ذاتِ حق کی سرزمین پر لہرانے کی توفیق ارزاں ہو۔ آمین! وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔

محمد سمعان خلیفہ ندوی

(جامعہ اسلامیہ، بھٹکل)

کلماتِ عالیہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم

(ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ- صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ)

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين خاتم النبيين سيدنا محمد، وعلى آله وصحبه الغرّ الميامين، ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين، ودعا بدعوتهم أجمعين، أما بعد!

چین کا ملک اقصائے مشرق میں واقع ہے، اور اپنے رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے دنیا کا ایک بڑا ملک ہے، ان کا مذہب بدھ مذہب کی ایک قسم قرار دی جاتی ہے، لیکن کمیونزم کے وہاں آنے پر کمیونزم ان کا طریقۂ کار بن گئی، اور مذہب کی حیثیت دبا دی گئی، پھر بھی مذہب کے لحاظ سے دیکھا جائے تو متعدد مذاہب کے لوگ وہاں ملیں گے، اسلام کا پیغام شروع کی صدیوں میں ہی وہاں پہنچ گیا تھا، اور بتدریج مسلمانوں کی کچھ آبادی وہاں بن گئی تھی، جو اپنے مذہب کی تعلیمات کے مطابق زندگی گذارنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، کمیونزم کے آنے کے بعد وہاں ایک عرصے تک دنیا کے دیگر علاقوں سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہوئے وہاں کا نظام چلتا تھا، باہر کے لوگوں کو وہاں کی معلومات ٹھیک سے نہیں پہنچ پاتی تھی، اب کچھ دنوں سے وہ پابندیاں باقی نہیں رہیں، اور وہاں پر لوگوں کی آمد و رفت شروع ہوئی ہے۔

بھٹکل کے عزیز نوجوان مولوی سمعان خلیفہ اور ان کے کئی ساتھی کچھ مہینے پہلے وہاں گئے اور وہاں کے حالات کا مشاہدہ کیا، اور وہاں کے مسلمانوں سے مل کر ان کے حالاتِ زندگی معلوم کرکے مفید معلومات جمع کی ہیں؛ اس طرح ان کا یہ ایک اچھا سفرنامہ بن گیا، انھوں نے اس کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے، اس میں درج معلومات دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائیں گی؛ اس لیے کہ ایک ایسا علاقہ جہاں کی معلومات حاصل کرنا قابل عمل نہ تھا؛ ان کی معلومات نئی ہونے کی بنا پر، اور علاقائی اثرات کی بنا پر جو خصوصیات و حالات مخصوص طور پر وہاں پائے جاتے ہیں' ان سے واقفیت معلومات میں اضافے کا ذریعہ بنے گی، خاص طور پر مسلمانوں کے حالات کا علم اور ان کو وہاں زندگی گذارنے میں جن چیزوں کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے، اور ان کے لیے اپنے دین پر عمل کرنے میں جن حالات سے گذرنا ہوتا ہے' ان سب سے واقفیت کا یہ ایک اچھا ذریعہ ہے۔

امید ہے کہ یہ کتاب لوگوں کے لیے دلچسپ ثابت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اس کو نافع بنائے، آمین۔

محمد رابع حسنی ندوی/ ندوۃ العلماء، لکھنؤ

مقدمہ

جناب مولانا عمیر الصدیق دریابادی ندوی مدظلہٗ
(رفیق دارالمصنفین - مدیر ''معارف'' اعظم گڑھ)

سیر وسیاحت کہتے ہیں انسان کی فطرت میں ہے؛ اس لیے فطرت ودیعت کرنے والے نے اس کی ایک سمت متعین کردی کہ جس زمین کو زندگی کی کچھ ساعتیں گزارنے کے لیے بطور مستقر مقرر کیا گیا' اس میں چل پھر کر دیکھو کہ عمل تخلیق ہے کیا؟ اس کا اولین مرحلہ کیا ہے؟ اور دوبارہ اللہ اس عمل کو کیسے دہرائے گا؟ سیر وسیاحت کی یہ سمت دراصل کسی بھی سفر کا حاصل ہے۔ پھر یہ سفر خواہ زمین کا ہو یا اس سے بھی بلند آسمانوں کی نامعلوم دنیاؤں کی گذرگاہوں کا' جو اس مقصد سے انحراف کرتے ہوئے گذرے تو اس کا شمار خالق وفاطر سے روگردانی والوں میں ہونا ہی ہے۔

سفر کو مذہب کی نگاہ سے دیکھنے والوں کے لیے سفر کی یہی ضرورت واہمیت کافی ہے، اب اس کے بعد جو کہیے اسی اجمال کی تفصیل ہی ہے کہ انسان جب اپنے ماحول کی یکسانی سے اکتاتا ہے تو تبدیل مکان اور جہانِ گزراں سے گزرنے کی خواہش اسے آمادۂ سفر کرتی ہے یا پھر حوصلہ مندی نئی راہوں اور نئی گذرگاہوں کو تلاش کرنے اور کشکولِ علم ومعرفت کو کچھ نیا پن دینے کا جذبہ عطا کرتی ہے؛ فطرت کی یہی آمادگی اور منازل کو طے کرنے کی یہی آرزو کسی عام انسان کو ایک خاص مسافر یا سیاح کے روپ میں ڈھال دیتی ہے؛ خاص یوں کہ یہی مسافر' اجنبی فضاؤں اور اَن دیکھے اور انوکھے مناظر کی دید سے اپنی فکری دنیا کو نیا رنگ دینے والا بن جاتا ہے، زندگی کی رنگارنگی اور بو قلمونی' تجربوں کا دامن وسیع کرتی نظر آتی ہے، اور اس طرح ایک عام انسان اچانک خاص بن جاتا ہے، پھر وہ زندگی کی تصویرکشی جس طرح کرتا ہے اس سے دوسروں کی دنیا میں بھی حیرت، عبرت، مسرت اور حقیقت کے رنگ بکھرنے لگتے ہیں، یہ رنگ آہستہ آہستہ اتنے گہرے ہوتے جاتے ہیں کہ انسانی زندگی کی علمی کائنات کا یہ بیش قیمت سرمایہ بن جاتے ہیں، اور بات یہاں تک پہنچتی ہے

کہ یہی سرمایہ اہل نظر کی نظر میں تاریخی تسلسل کا اہم اور دلچسپ ذریعہ قرار پاتی ہیں۔

سیر وسیاحت سے متعلق یہ چند باتیں بطورِ تمہید عام طور سے کہی جاتی رہی ہیں۔ ہم نے بھی جب اپنے حوصلہ مند نوجوان' عزیز مسافر کے ایک سفر کی مختصر سی داستان پڑھی تو ان اصولوں کو یاد کرنے کی مہلت مل گئی۔

سفر کی یہ داستان کرۂ ارض کے ایک ایسے حصے کی ہے جو دنیا کا گویا ایک سرا یا کونہ ہے، ایسا گوشۂ ارض جو ۳۷/ لاکھ مربع میل کے رقبے میں اپنی وسعت کو اپنی گنجان آبادی کے لیے دراز کیے ہوئے ہے، پھر بھی وہ ہمیشہ دنیا کے دوسرے حصوں کے لیے تجسس اور حیرت کا سبب رہا، افسانوی اور دیومالائی قصوں کی طرح وہ ہمیشہ انوکھا، اور اپنی کہانیوں کی وجہ سے ناقابل یقین خطۂ زمین بعنوانِ چین بنا رہا، اور آج بھی جب کہ پورا کرۂ ارض جامِ جم بن چکا ہے' چین اپنی اساطیری اداؤں سے تحیر اور استعجاب کی فضا قائم کیے ہوئے ہے۔

لوگ اس کی تہذیب کی قدامت تلاش کرتے رہے، کون سی لنگ کے پہاڑ اور یانگ سی کیانگ اور سی کیانگ کے دریا گنگ وجمن، دجلہ وفرات اور جیجون وسیحون کی یاد دلاتے رہے، ارژنگِ چین اور اژدہائے چین نئے صوتیات سے آشنا کرتے رہے، چینی ظروف کیا کم تھے کہ ان کی نقاشی' مانی وبہزاد کی مصوری کو ماند کرتی رہی، کاغذ سازی اور شیشہ گری میں چینی صناعی نے دنیا کو حیرت خانے میں بدل دیا، یہی ہاتھ اور ذہن اور نظر بہکے تو مجسمہ سازی، مصوری اور شاعری کی دنیا بھی اتھل پتھل ہوگئی۔ جن ہاتھوں نے ظروف کی وجہ سے انسانی ظرف کے پیمانوں کو بدلا' انھوں نے ریشم وکمخواب کے ساتھ خزف ریزوں کو ایسا چمکایا کہ انسان کے احسن خلق ہونے کے ثبوت کی ضرورت نہیں رہی۔ دیوارِ چین کہیں یا سد سکندری؛ عقل کو حیرت میں ڈالنے والے کارنامے یاجوج ماجوج کے وجود کی دہشت کا سبب تک بن گئے، اور ان سب سے بڑھ کر یونان ومصر وروما کے تمام عقلی، تہذیبی اور ثقافتی امتیازات کے مدمقابل حکمت چینی کا دبدبہ ایسا قائم ہوا کہ اہل بصیرت کے دلوں سے آواز اٹھی کہ علم وحکمت کے حصول کا شوق اگر جذبوں میں ہے تو پھر اس کے لیے رخ چین ہی کا کرو؛ اس قول کی معنویت کو قیمت عطا کرنے کے لیے اس کو معلمِ اخلاق وانسانیت (ﷺ) کی زبانِ مبارک سے منسوب کیا گیا؛ یہ ثابت نہ بھی ہو تو بھی چین کے علم وحکمت کے اعتراف کے لیے اس سے بڑھ کر سند کہیں اور نہیں مل سکتی!

ہوا بھی یہی کہ تانگ خاندان کے عہد میں جب شاعری، مصوری اور نقاشی بامِ عروج پر تھی، حجاز کی پاکیزہ خارا شگافی کی بادِ نسیم' چین کی وادیوں سے پہلی بار ہم کنار ہوئی؛ کہتے ہیں کہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص جیسے صحابیِ جلیل کے قدموں سے چین کی سرزمین نے برکتوں کے نقوش کو اپنے وجود سے ہم آہنگ ہوتے دیکھا، ان پراسرار بندوں سے' جنھیں ذوقِ خدائی بخشا گیا اور جن کی ٹھوکروں سے صحرا و دریا دونیم ہو جایا کرتے تھے' یہ پراسرار سرزمینِ چین ایسی لذت آشنا ہوئی کہ کہنے والے کہہ اٹھے کہ نویں صدی عیسوی سے اب تک کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا کہ جس میں کسی نہ کسی عالم نے زمین چین کے متعلق لب کشائی نہ کی ہو۔ سیاحوں کے سرخیل' ہمارے ہی نہیں' دوسروں کے بھی' ابن بطوطہ ہیں؛ ایک دنیا دیکھی، دوسروں کو دکھائی، لیکن چین پہنچے تو کہہ اٹھے کہ بڑا وسیع اور زرخیز ملک ہے، زراعت، سونے چاندی، اور میوؤں کی پیداوار میں کوئی ملک اس کا ہم سر نہیں، اس کا دریا ہی آبِ حیات ہے۔ ابن بطوطہ تو مثال ہیں، ورنہ ہمالہ کے اس پار والے بھی جوش میں آئے تو کہنے لگے ؎

دشت میں' دامنِ کہسار میں' میدان میں ہے
بحر میں' موج کی آغوش میں' طوفان میں ہے
چین کے شہر' مراکش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے
چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ 'رفعنا لک ذکرک' دیکھے

اسی شاعرِ مشرق کا دل نہ بھرا تو پھر یاد کیا اور یاد دلایا ؎

چین و عرب ہمارا سارا جہاں ہمارا

سارے جہاں سے چین و عرب کا استثناء یوں ہی نہیں۔

ایک بار پھر یاد آئی تو اس طرح آئی ؎

فاش یوں کرتا ہے اک چینی حکیم اسرارِ فن
شعر گویا روحِ موسیقی ہے، رقص ہے اس کا بدن

چینیوں کی نگہِ نیم باز کے ذکر سے کون باز آ سکتا ہے، اقبال نے خدا جانے کس سے خطاب

کیا مگر گراں خواب چینی کو ہم مصداق سمجھیں تو غلط کیا؟ ؎

غلط مگر ہے تری چشمِ نیم باز اب تک
ترا وجود ترے واسطے ہے راز اب تک

جن کا وجود واقعی راز تھا وہ چینی' چینی گڑیا، چائے اور چناں وچیں کے ذریعے کیسے فاش ہوتے رہے؟ سوال تو ہے۔

شاید اسی سوال کے جواب کی تلاش میں ہمارے نوجوان سیاح سمعان خلیفہ اپنے آباء واجداد کی تقلید میں چین کے لیے بے چین ہوئے، ابھی وہ عمر کی ان نہایتوں تک نہیں پہنچے ہیں جہاں یہ کہا جا سکے کہ ؎

بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند
سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند

نہ دانش و بینش کی اس پختگی کے قریب ہیں جو یہ سوچنے پر آمادہ کر دے کہ ؎

سفر زندگی کے لیے برگ و ساز
سفر ہے حقیقت، سفر ہے مجاز

مگر ان کی فطرت کی سلامتی پر یقین ضرور ہے جو ان سے سرگوشیاں کرتی رہی ہوگی کہ ؎

منظر وہ طلب کر کہ تری آنکھ نہ ہو سیر

بس یہ کتاب اسی سیر نہ ہونے والے منظر کا مرقع ہے۔ اس سفر کا مقصد تو وہی تھا جس کا آغاز حضرت ابن ابی وقاصؓ سے ہوا تھا، لیکن سفر تو سفر ہے، ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں آتے رہے، اور نوجوان سیاح کے چشم و دل میں سماتے رہے، لطف و لذت و حیرت و مسرت کا ایک خوان ان کے سامنے سجتا رہا؛ یہ ان کی روایتی فیاضی ہے کہ اس خوانِ نعمت میں اب ان کو شریک کر رہے ہیں جو صرف سراپا حسرت ہیں۔

ایسا نہیں کہ چین کی سیر کرنے والے اردو کے اور سیاح نہیں گزرے، ان میں اور اس سفرنامے میں فرق صرف اتنا ہے کہ اس کا مقصد چینی مسلمانوں کی دینی و مذہبی شناخت اور اس کے احیاء و بقا کا مشاہدہ اور اس میں اپنی عملی مساعی کا رنگ پیش کرنا تھا؛ اس لحاظ سے یہ سفرنامہ ایک نیا منظر نامہ ہے، اب یہ اور بات ہے کہ چھینگ ڈو، ہنزو، یؤ، شانگھائی، لانزو، لنشیا، شیننگ،

شی آن کے مقامات گذشتہ سفرناموں میں کم دکھائی دیں، مقامات تو وہی ہیں، ہاں شاید نام ضرور بدلے ہیں۔ سیاح کے صاحب فکر ونظر ہونے میں شبہ نہیں؛ اشیاء کی حقیقت کو جو دیکھ سکے وہی اصل نظر ہے اور وہی نظر اس مختصر سفر میں سطر در سطر سامنے آتی رہتی ہے، ہم مثالیں دے کر قارئین کے اصل لطف میں حارج نہیں ہونا چاہتے، لیکن یہ ضرور کہنا ہوگا کہ فکر پاکیزہ ہو اور لہجہ شستہ وشائستہ ہو تو لطف دوبالا ہو کر رہتا ہے، بیان کے ساتھ زبان یعنی ہوش مندی کے ساتھ ارجمندی ہو تو وارداتِ قلب کو وہ لسانی پیکر مل ہی جاتا ہے جو انکشاف کو کشف سے مشابہ کر دیتا ہے۔

سفرناموں کے لیے عام طور سے کہا جاتا ہے کہ یہ اگر ادبی حسن سے عاری ہیں تو پھر یہ محض سفری بیان رہ جاتا ہے، ادبی چاشنی واقعی کامیاب سفرنامے کا جزوِ اعظم ہے، اس خصوصیت کا سطر سطر مشاہدہ اس سفر کا ہر مرحلہ ہے۔ اب شانگھائی کی رونمائی کو دیکھیے، جس کے حسن کو دیکھ کر سیاح پر خود فراموشی کی کیفیت طاری ہوئی لیکن خدا فراموشی سے وہ کیسے دور رہا؟ جواب یہی ہے کہ یہ اس کی فطرت کی سچائی ہے جس نے نہاں خانۂ دل سے آواز دی کہ ''رکیے! یہ تو دنیا ہے، یہ اتنی حسین اور پرلطف ہے تو پھر میرے رب کی بنائی ہوئی جنت اور سرمدی نعمت کے حسن کا عالم کیا ہوگا''۔ 'پرل ٹاور' کا ذکر قاری شاید بار بار پڑھے لیکن سیر نہ ہو، کوئی اور ہوتا تو شاید رنگ ونور کے اس سیلاب میں بہہ جاتا لیکن سیاح کا پاسبان عقل یہاں بھی کام آیا، حالاں کہ یہ احساس بھی تھا کہ ''عقل کو یارا نہیں کہ حسن ازل کو سوچے''۔

چین میں اسلام پر ماضی قریب میں کیا گزری اور اسلام کس سیلاب بلا سے دوچار رہ کر اپنے وجود کو برقرار رکھ سکا' سیاح کی نظر سے سب کچھ گزرتا رہا، حال کے دریچے وا تھے، ماضی کے غبار میں اس کو اپنی محبوب شخصیتوں کے عکس نظر آئے تو دل بے اختیار پکارا اٹھا: ''تری آواز مکے اور مدینے'' اور ''اک کلیم سربکف''؛ یہ صرف اشارے ہیں، اصل متن کی تلاش قاری کے لیے دشوار نہیں۔

سمعان خلیفہ کو یہ کامیاب سفر اور سفرنامہ مبارک ہو، کیوں کہ کہا یہی گیا ہے کہ ''ایک کامیاب سفرنامہ وہ ہوتا ہے جو صرف ساکت وجامد فطرت کا عکاس نہ ہو بلکہ لمحۂ رواں میں آنکھ، کان، زبان اور احساس سے ٹکرانے والی ہر شئ نظر میں سماجانے والی ہو... جو بیان کو مرقعِ بہار بنادے اور قاری ان تمثالوں میں جذب ہو کر خود کو اس مرکب آئینہ گری کا حصہ بنالے''۔

عمیر الصدیق ندوی
دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چل مرے خامہ بسم اللہ

۹/ستمبر منگل کی شام تھی، حسب معمول جامعہ سے لوٹ کر گھر پہنچا، جلدی سے ضروریات سے فارغ ہو کر آفس کی راہ لی، اسی دوران ۳۰-۵ بجے مولانا فیصل احمد ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء) کا فون آیا کہ میں چین کے علمی ودعوتی سفر پر روانہ ہو رہا ہوں، مقصد یہ ہے کہ چینی مسلمانوں کے حالات سے واقفیت حاصل کی جائے، تاریخ کی کڑیوں کو تلاش کیا جائے، مسلمانوں کے مسائل سے آگاہی ہو، اور دعوتی امکانات کا جائزہ لے کر کچھ عملی اقدامات کے لیے بھی سوچا جائے۔

مولانا کے سفر کی اطلاع تو اس سے تقریباً ایک ہفتے قبل مل چکی تھی مگر اس وقت کوئی عندیہ ساتھ چلنے کا نہیں ملا تھا، اور میں نے بھی بالکل اس سلسلے میں کچھ نہ سوچا تھا، (قدرت کے فیصلے ایسے ہی ہوتے ہیں کہ انسان کو سان وگمان بھی نہیں ہوتا)، سوچتا بھی کیسے؟ تدریسی مشغولیت اس کا موقع ہی کب دیتی ہے اور پھر شام کے وقت کچھ تجارتی مشغولیت بھی پیروں میں زنجیر ڈال دیتی ہے؛ پھر بھی میرے مشفق استاذ ماسٹر سیف اللہ صاحب ہر ملاقات پر مجھے Explorer (سیاح) کہہ کر پکارا کرتے ہیں؛ اس لیے کہ سیر فی الارض کا کوئی موقع گنوانا نہیں چاہتا ہوں اور سفر سے خود تجربات میں بھی کافی اضافہ ہوتا ہے اور قلب ونظر کو سوچنے کے زاویے ملتے ہیں، ذہن کے دریچے کھلتے ہیں، شعور ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہے اور خاص طور پر جب کہ سفر کے مقاصد وہ ہوں جو اوپر بیان کیے گئے تو جہاں تک ممکن ہو توکلاً علی اللہ ایسے موقع کو کیوں ہاتھ سے جانے دیا جائے اور کئی بار اس طرح کے مواقع سے فائدہ نہ اٹھانے کا ملال مدتوں دل میں کسک پیدا کرتا رہا ہے؛ مرشدی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم، مولانا واضح رشید حسنی ندوی مدظلہ العالی اور

مربی مرحوم مولانا عبداللہ حسنی ندویؒ اور دیگر قابل قدر شخصیات کا ایک وفد غالباً ۲۰۰۷ء میں مصر واردن اور سعودی عرب کے دورے پر نکلا تھا، بعد میں بہت افسوس ہوا اور ہوتا رہا کہ ایسے مبارک موقع پر مبارک شخصیات کی معیت میں سفر کتنا مبارک اور مفید تھا۔

کئی دنوں سے ہمارے حلقۂ احباب میں ترکی کے سفر کی بھی امنگ پیدا ہو رہی تھی اور اس کے لیے ذہنوں میں ترنگ بھی اٹھ رہی تھی کہ اچانک قافلۂ وقت کے حدی خواں نے حدی کی لے بڑھا دی اور سفرِ چین کی صدا دے دی۔ کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا، جیب پر بھی نظر گئی، مگر رب العالمین کی شان کریمی پر نظر ٹکی، اور طائر خیال نے پرواز شروع کر دی، اتنے میں ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر عبدالحمید اطہر ندوی کا فون آیا کہ مولانا فیصل صاحب نے مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی ہے، مگر میں اس شرط پر تیار ہوں کہ تم بھی ساتھ چلو گے۔

اب دو سے تین ہوگئے، اطہر بھائی کی موجودگی بھی قابل قدر تھی، مصطفیٰ طحان صاحب سے ان کے تعلقات کی وجہ سے دل میں خیال آیا کہ چلو، اب تو اچھا ہے، طحان صاحب کی نسبت اب چین کی غریب الوطنی میں کام آئے گی۔ (اب کام آئی یا نہیں یہ الگ بات ہے)، پھر اسی وقت اپنے محسن اور کرم فرما برادر اکبر محیی الدین فیصل سے مشورہ کیا، انھوں نے اسی وقت فیصلہ سنا دیا کہ بہت اچھا، فوراً تیار ہو جاؤ اور اس کے لیے سفر کی ضروری کارروائی میں لگ جاؤ۔ بس پھر کیا تھا سماعت کے راستے سے دل کو دستک دینے والا خیال اب دل میں جاگزیں ہوگیا، اسی لمحے گھر کی طرف چلتا بنا۔

۲۰۱۱ء میں بھی اسی طرح آن کی آن میں قسمت نے یاوری کی تھی اور بیت اللہ کے مشتاقانِ دید میں پل بھر میں شامل ہوگیا تھا، سوئے حرم چل پڑا اور دنیا نے ہمیں بھی حاجی کہا۔

گھر پہنچ کر پاسپورٹ لیا، بھائی اطہر بھی آگئے، تصویریں کھنچوائیں، اسی لمحے اسٹیشن پہنچ کر ممبئی جانے والے ایک صاحب کے ہاتھ پاسپورٹ تھما دیے؛ کیوں کہ پاسپورٹ کو ممبئی کے راستے دہلی پہنچنا تھا، اور ہفتہ بھر میں ہمیں رخت سفر باندھنا تھا، دو روز میں پاسپورٹ دہلی پہنچا، بروز جمعہ سفارت خانے میں جمع ہوا، سنیچر اور اتوار دو روز تعطیل کی وجہ

سے پیر کی شام کو ویزے کی منظوری کی اطلاع ملی، سفر کی ضروری تیاری کی گئی، مشورہ ہوا، مولانا فیصل صاحب کا ویزہ تین ماہ قبل ہی لگ چکا تھا اس لیے ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ جمعرات سے قبل ہی پہنچ جائیں، چنانچہ وہ منگل کی شام ہی کو چین (ایرنا کولم) کے لیے روانہ ہوگئے کیوں کہ انھیں ایئر ایشیا کی پرواز سے بدھ کی شام کو چین سے ہنزو کے لیے روانہ ہونا تھا، ہم لوگوں نے مناسب سمجھا کہ جمعرات کی شام کو سفر کیا جائے، اور مدارس والے جانتے ہیں کہ جمعرات کی شام سفر کی ابتدا کی کیا معنویت اور افادیت ہے۔

پابہ رکاب میں

بہر حال ویزے کی اطلاع ملتے ہی ہم نے اپنے آفس (بھٹکل ٹراویل ہاؤس) سے ممبئی تا ہنزو ایئر چائنا کا ٹکٹ بک کرا لیا، اور ۱۸/ ستمبر جمعرات کی شام ہم دونوں بذریعۂ ٹرین ممبئی کے لیے روانہ ہوگئے، چوں کہ دوستوں نے چین میں درپیش کھانے کے مسئلے سے خبردار کر کے خطرے کا الارم بجا دیا تھا اس لیے کافی زادِ راہ لے کر پابہ رکاب ہوئے مگر آنے والے وقت نے ان ساری پیش گوئیوں اور قیاس آرائیوں کو غلط ثابت کیا اور اہل چین کی غریب الدیار مسافروں پر کرم فرمائیوں اور دعوت شیراز کو پیچھے چھوڑ دینے والی مہمان نوازیوں نے دلوں پر انمٹ نقوش چھوڑے۔

۱۹/ ستمبر کی صبح ہم پنویل اسٹیشن پر تھے، وہاں سے اطہر بھائی کے بہنوئی سعد اللہ بھائی سے ملاقات کے لیے کرلا جانا تھا؛ اس لیے کم وقت اور کم پیسے میں منزل پر پہنچنے کی آس میں ممبئی لوکل کا سہارا لیا؛ مگر واہ رے اچی ممبئی! اور داد دینی پڑے گی ممبئی کے باسیوں کو، کس طرح بھیڑ بھڑکے میں یہ لوگ سوار بھی ہوتے ہیں اور آن کی آن میں زور لگا کے ٹرین سے اتر بھی جاتے ہیں، یہ بھی دیکھنے کا ایک منظر ہوتا ہے ہمارے مہان دیش کی ایک پہچان کو، ہر کس و ناکس اور پھر "آفاقی" کی مجال نہیں کہ اترے اور چڑھے، ہم جیسے "شریفوں" کے تو پسینے چھوٹ رہے تھے اور بالخصوص جب کہ ہم لدے پھندے بھی تھے، ٹرین پر سوار ہوتے ہی مسافروں نے پیش گوئی کر دی تھی کہ آپ لوگوں کے بس کا نہیں کہ سامان کے ساتھ اتر پائیں اور خود ہمارے کلیجے

بھی منھ کو آنے ہی والے تھے کہ مسافروں نے حل بھی بتا دیا کہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں، اگلے اسٹیشن پر اتر جائیے گا! ہم غریبوں نے چین کی سانس اس وقت لی اور اکھڑا ہوا دم اس وقت بحال ہوا جب کرلا اسٹیشن پر دیکھتے دیکھتے اژدحام کا خوفناک اژدہا نظروں سے غائب ہوا اور یہ سین ڈراپ ہو گیا اور ہم اگلے اسٹیشن پر اترنے میں کامیاب ہو گئے، اس سے پہلے لکھنؤ کی طالب علمی کے زمانے میں بھی ہم نے ممبئی لوکل کے سفر کیے ہیں مگر اب کی بار جو منظر دیکھا (اور اس لیے بھی کیوں کہ آفس کے اوقات کا عین الیقین مشاہدہ آج سے پہلے نہیں کیا تھا) وہ اتنا خطرناک اور ڈراؤنا تھا کہ اس کا تصور بھی بدن کے رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔

نمازِ جمعہ اور تلخ یادیں

یہ میں کہاں ذکرِ ممبئی میں لگ گیا، مجھ کو تو ابھی بہت دور ماؤزے تنگ کے دیس جانا ہے، مگر رکیے، آج جمعہ ہے، ابھی ممبئی میں جمعہ کی نماز بھی تو پڑھنی ہے، چلیے، کرلا ہی کی ایک جامع مسجد میں چلتے ہیں، چلے اور جمعہ کی نماز سے فارغ بھی ہو گئے مگر تلخ تلخ یادیں لے کر، فضا میں دھواں دھواں تھا مگر آج جس دھوئیں میں سانس لی وہ آگ سے اٹھنے والا دھواں نہ تھا بلکہ دلوں کا غبار تھا، کدورتوں کا انبار تھا، اپنے ہی کلمہ گو بھائیوں کے خلاف سینوں میں پکنے والا لاوا تھا جو پھوٹ رہا تھا اور خرمنِ دل کو جلا کر خاکستر کر رہا تھا اور خاص طور پر ہم لوگوں کی (جن کے ذہنی سانچے اپنا تعلیمی وتربیتی پس منظر رفع نزاعِ باہمی کے تناظر میں رکھنے کی وجہ سے اس طرح کی ہنگامہ آرائیوں کو قبول کرنے سے گریزاں رہتے ہیں) تو سانس بھی گھٹ رہی تھی، ہر چند کہ ان کے فریق اسلاف کرام اور بالخصوص ائمہ مجتہدین کے خلاف "طوفانِ بدتمیزی" اُٹھاتے ہوں اور کتاب وسنت کے نام نہاد علم بردار بن کر فقہ اور فقہاء کی خدمات کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے پر تلے ہوں، اور مغالطوں کے سہارے فتنہ وفساد کی آگ لگاتے ہوں مگر ان کی آگ کو بجھانے کے لیے ہمارے بھائیوں کو مزید آگ لگانے کی تو ضرورت نہیں، اس آتشیں دور میں، فتنوں کے اس ہنگامے میں، نفرت کی ان فضاؤں میں محبت کے دیے جلانے کی ضرورت ہے، محبت کا ابرِ بہاراں بن کر چھا جانے کی ضرورت ہے، پیغامِ الفت کو عام کر کے دلوں کو جیتنے کی ضرورت ہے، مگر

افسوس! ہم لوگ مزید جلتی پر گھی ڈال دیتے ہیں، "اللہ ہر جگہ نہیں ہے، صرف عرش پر ہے" کے حوالے سے ایک فریق جو ہنگامۂ محشر برپا کرتا ہے (اور جنتی اور جہنمی کی سند اسی کے تناظر میں دینے پر تلا ہوتا ہے) آج اس کا جواب دیا جا رہا تھا اور پتہ نہیں عوام کے کچھ پلے پڑ رہا تھا یا نہیں، مگر ہم "پڑھے لکھوں" کے تو سروں کے اوپر سے یہ آندھی گزر رہی تھی۔ گھمسان کی جنگ جو جاری تھی، حق وباطل کا فیصلہ آج ہی ہونا تھا اسی لیے سارا زور لگایا جا رہا تھا اور معاف کیجیے یہ اس نظامِ تعلیم کا فیض تھا جس نے مناظرے کے میدان میں خوب طبع آزمائی کی مگر کارزارِ حیات کے لیے زمانے کے ہتھیاروں سے لیس ہونے پر توجہ نہ دی، جس نے میدانِ جنگ میں ہتھیاروں کی قدامت وجدت پر خوب لاطائل بحثیں کیں، مگر مقابلے کے لیے پوزیشن نہیں سنبھالی، جس نے علمی موشگافیوں میں تو خوب جوہر دکھائے، مگر زمانے کی نبض کو پہچاننے والے ماہرین کم پیدا کیے، جس نے زندگی کی کشت زار کو آبِ حیات سے نہیں سینچا، جس نے مدتوں قبل اپنی بساط لپیٹ دینے والے استخراجی منطق اور بال کی کھال نکالنے میں پورا زور صرف کیا مگر استقرائی منطق پر کوئی توجہ نہ دی، جس کے "سپوتوں" اور "سورماؤں" کا سمندِ تحقیق جزوی اختلافی مسائل میں سرپٹ دوڑتا رہا مگر جب تجارتی اور اقتصادی مسائل وغیرہ کا پڑاؤ راستے میں آیا اور دینِ اسلام کی حقانیت کو اس راستے سے ثابت کرنے کی ضرورت پیش آئی تو یک قلم پیروں میں زنجیریں پڑ گئیں اور آخرِ شب کے مسافر ستاروں کی تنک تابی کو دیکھ کر نویدِ صبحِ روشن کی امید رکھ کر تازہ دم ہونے کے بجائے تھک ہار گئے، اب تک خیالات وافکار کی دنیا میں جو ابال تھا، علم وتحقیق کے دریاؤں میں جو آبشاروں کی روانی بلکہ طوفانوں کی طغیانی تھی، یہ کیا ہوا کہ یک دم جمود طاری ہو گیا، تہیں جم گئیں، زبانیں گنگ ہو گئیں، نگاہیں اٹھی رہ گئیں، علمی رسوخ رکھنے کے باوجود زبانوں کے معاملے میں ہم پیچھے رہ گئے؛ نتیجۃً وہ طبقہ پردہ کے سامنے آ گیا جس نے من مانی انداز میں دین کی تفہیم وتشریح کر ڈالی بلکہ ان کی ستم ظریفیاں ابھی تک جاری ہیں اور امت اب تک ان کمین گاہوں سے محفوظ نہیں اور ہماری بے حسی اور غفلت وبے توجہی دیکھ کر جلد کوئی امید بھی نظر نہیں آتی مگر جب تازہ دم قافلۂ اسلام کی فتوحات کا مشاہدہ ہوتا ہے اور دنیا کے غربت کدوں میں

جب آفتابِ اسلام جلوہ دکھاتا ہے تو ان محرومِ تماشا آنکھوں میں امید کے جگنو چمکنے لگتے ہیں اور دل میں روشن مستقبل کی امنگیں جاگ اٹھتی ہیں۔

الغرض یہ تو جملۂ معترضہ تھا جو کسی قدر طویل ہوگیا اور دل کی بات تھی جو اس موقع پر زبان پر آگئی ورنہ کسی کی تذلیل اور تحقیر ہرگز مقصود نہیں ہے۔

چھینگ ڈو (Chengdu) ہمارے لیے چین کا باب الداخلہ

۲۰/ستمبر کا سورج فضا پر اپنی روشنی بکھیر چکا تھا بلکہ کسی قدر تیزی آچکی تھی، ہم چھینگ ڈو (Chengdu) ایئرپورٹ پر پہنچ چکے تھے، صبح کے تین بجے ایئر چائنا پر سوار ہوئے، کچھ دیر ایئر چائنا کی چینی ضیافت سے لطف اندوز ہوئے بلکہ (اردو والوں سے معذرت کے ساتھ) لطف انداز ہوئے، اور پھر سیٹوں پر دراز ہوئے، کچھ دیر کے بعد اپنے اجتہاد سے نماز فجر پڑھی اور نیند کی آغوش میں چلے گئے، آنکھ اسی وقت کھلی جب پانچ گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد جہاز کا کپتان چھینگ ڈو (Chengdu) ایئرپورٹ پر اترنے کا اعلان کر رہا تھا، ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد انسان ہونے کے ناطے انسانی ضروریات نے پیٹ میں کچھ ہلچل پیدا کی تو سب سے پہلا کام قضائے حاجت کا تھا جس کے لیے بالکل ''خالی الذہن'' ہوکر یہ غریب الدیار بیت الخلا میں داخل ہوئے مگر داخل ہوتے ہی اوسان خطا ہوگئے، یہ کیا؟ ارے توبہ! اب یہاں پانی نہیں ملے گا! ہم جیسوں کے لیے تو یہ کسی مصیبت سے کم نہیں تھا اور صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہوا جا رہا تھا، در در کی ٹھوکریں کھائیں مگر وہاں پر لوٹے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، چینی تہذیب سے پہلا واسطہ آج پڑ رہا تھا، یوں تو کچھ بھنک سفر سے پہلے ہی کانوں میں پڑ چکی تھی مگر یہ نہیں سوچا تھا (اور خوابوں میں بھی نہیں سوچا تھا) کہ یہ دن بھی دیکھنے پڑیں گے، بعد میں ہمارے دوستوں نے بتایا کہ انھیں افسوس اس بات کا ہوا کہ انھوں نے قبل از وقت ہمیں اس سلسلے میں کیوں خبردار نہ کیا، پھر بعد میں تو پورے سفر میں ایک بوتل ضرور ہمارے رخت سفر میں شامل رہی کہ بوقت ضرورت باہر سے پانی بھر کر بیت الخلا میں لے جایا جا سکے، یہ چینی تہذیب و تمدن کی ایک غلط روایت ہے جو ان کے یہاں رائج ہے بلکہ اس سے وہاں کے دین دار بھی محفوظ نہیں، عام مزاج ٹشو پیپر کے استعمال

کا ہے، چاہے قضائے حاجت کی کوئی بھی قسم درپیش ہو ہر موقع پر یہ حضرات کس طرح ٹشو پیپر پر کفایت کر لیتے ہیں اس کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آئی، حالاں کہ صحت پر چین میں خوب توجہ دی جاتی ہے، آگے چل کر اس کے مظاہر ہم دیکھیں گے مگر اس موقع پر جب کہ پانی کے بجائے صرف ٹشو کا استعمال طبی اعتبار سے کتنا مضر ہے اور گندے بیکٹیریا کس قدر مفاسد پیدا کرتے ہیں پتہ نہیں اہل چین کی اس پر کیوں نظر نہیں جاتی، بلکہ حد تو یہ کہ ہم لوگ پانی لے کر اندر جاتے ہیں تو یہ حضرات ان غریب الدیار مسافروں کو تعجب سے دیکھنے لگتے ہیں:

ماہر! یہ جدتیں، یہ ترقی پسندیاں
جتنے بھی عیب تھے وہ ہنر ہو کے رہ گئے

مغربی ملک کے ایک باشندے کے بارے میں ایک لطیفہ جو سن رکھا تھا آج یاد آرہا تھا، ایک انگریز نے برصغیر کا سفر کیا، یہاں کا مصالحہ دار کھانا تناول کیا، پھر جو پیٹ میں آگ لگ گئی تب کہیں جاکر اس کی سمجھ میں بات آئی کہ اچھا، یہی وجہ ہے کہ یہاں والے ٹشو کا استعمال نہیں کرتے ہیں، اتنی مرچیں کھا کر کاغذ کا استعمال کرنے پر آگ نہ لگے تو اور کیا ہو؟

جتنی مسجدوں میں جانا ہوا خال خال بلکہ یاد تو آرہا ہے کہ صرف ایک مسجد (شی آن یا شیتنگ کی ایک مسجد) یا دو مسجدوں کو چھوڑ کر کہیں بھی بیت الخلا میں پانی دستیاب نہیں ہے، باہر سے وضو کے لوٹے لے کر ہی جانا پڑتا ہے، ہمارے مولانا عبدالحمید اطہر صاحب نے تو پیش کش بھی کر دی کہ طہارت کے احکام کے موضوع پر وہ جلد ہی ایک رسالہ مرتب کر کے بھیج دیں گے جس کا یہاں ترجمہ کیا جائے اور اس کے تئیں بیداری لائی جائے، خدا کرے کہ یہ کوشش بارآور ثابت ہو، اور طہارت کا شعور اہل چین میں بیدار ہو جائے۔

ایک اور چیز جس نے چھینگ ڈو (Chengdu) ایئرپورٹ پر ہمیں استعجاب (مگر مسرت آمیز) میں ڈالا وہ ایمیگریشن سسٹم کی تیزی اور چستی و پھرتی تھی، ایمیگریشن ونڈو (Window) پر ایک الیکٹرانک تختی ہم ہندوستانیوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر رہی تھی، اس تختی کے ذریعے مسافروں کو اس کا موقع فراہم کیا جا رہا تھا کہ ایمیگریشن افسران

کے کام کاج سے اطمینان نہ ہونے کی صورت میں نیز یہاں وقت زیادہ ضائع ہونے کی صورت میں اپنی شکایات اس پر لگے بٹن کے ذریعے ارباب حکومت تک پہنچائیں، یہ ایک قابل تقلید عمل ہے جو یہاں نظر آیا۔

آج انگریزی کوئی نہیں جانتا!!

ہمیں یہاں سے فوراً دوسری فلائٹ کے ذریعے ہنزو جانا تھا اس لیے زیادہ وقت ہم یہاں رک نہ سکے، خود ممبئی سے آنے والا جہاز بھی پہلے سے تین گھنٹے تاخیر سے چلا تھا، اس لیے ہمیں ضرورت تھی رہنمائی کی، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہاں جانا ہے اور کس جہاز میں سوار ہونا ہے، ہم نے ایمیگریشن حکام سے انگریزی میں پوچھا، مگر یہ کیا! یہ لوگ انگریزی سے بالکل نابلد! ہم لوگوں کے سان وگمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی ملک ایسا بھی ہوگا جہاں انگریزی نہ سمجھی جاتی ہو، (یہ تو سنا تھا کہ ایسے ملک ہیں اور خود یورپ میں بھی جہاں انگریزی بولی نہیں جاتی)، ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکتا ہے، ہم لوگ مرعوب ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انگریزی ہمیں آگئی تو بہت کام کے ہوگئے، یقیناً انگریزی کی اہمیت ہے اور اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے مگر صرف ان ممالک میں اہمیت ہے جہاں یہ بولی اور سمجھی جاتی ہے، یہاں چین میں دیکھیے؛ ہم لوگ بے زبان تھے، زبانِ بے زبانی بلکہ زبانِ انسانی میں ہم نے ان لوگوں سے باتیں کیں، اس ''زبانِ انسانی'' نے چین میں غربت کا احساس ہم غریب الدیار مسافروں کو ہونے نہیں دیا، پورے سفر میں تنہا ہونے کے باوجود کہیں خوف وہراس نے دل پر بسیرا نہیں کیا، مسکراہٹ نے تقریباً ہر جگہ ہمارا استقبال کیا، بلکہ ایک موقع پر جب کہ ہم شی آن کے ریلوے اسٹیشن پر بے یار ومددگار کھڑے تھے تو ''انسانیت'' کی اسی رمق نے ہمیں انسانیت سے مایوس نہ کیا اور اہل چین کی مسکراہٹوں نے اپنا اسیر کیا۔

آبادی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو چین میں دنیا کی ایک چوتھائی سے کچھ زیادہ ہی آبادی پائی جاتی ہے اور اگر دوسرے ممالک روس وغیرہ اور خود یورپ کے بہت سارے ممالک کو اس فہرست میں شامل کیا جائے جہاں اپنی مقامی زبان ہی بولی اور سمجھی جاتی ہے تو

پھر مشکل سے براعظم ایشیا کو چھوڑ کر دنیا کی ایک محدود آبادی ہی انگریزی سمجھتی ہے، ضرورت انگریزی کی بھی ہے، اسی کے ساتھ ہی دیگر عالمی زبانوں کی طرف بھی توجہ کی ضرورت ہے۔

مجھے اس موقع پر بچپن کی ایک بات یاد آرہی ہے، جب ہم عربی چہارم یا پنجم میں تھے، اور یہ کوئی ۱۹۹۸ یا اسی کے آس پاس کا قصہ ہے، جامعہ میں ایک تبلیغی وفد آیا ہوا تھا جس کی سربراہی بنگلور کے فاروق بھائی کررہے تھے، انھوں نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ عزیز طلبہ! آپ عربی زبان میں کمال پیدا کریں دنیا آپ کی منتظر ہے، انگریزی یا کسی دوسری زبان سے مرعوب نہ ہوں، میں نے مشرق ومغرب کا سفر کیا ہے، آدھی دنیا میں نے دیکھی ہے، اس لیے بتاتا ہوں کبھی انگریزی سے مرعوب نہ ہونا، یہ آج ہے کل ہوسکتا ہے نہ رہے، مگر عربی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی؛ ان کی یہ کچھ باتیں آج بھی دل کے نہاں خانے میں محفوظ ہیں۔ اور ہمارے اس سفر میں خود ہمیں اس کا تجربہ ہوا، بہت کچھ ساتھ ہمیں اپنی عربی دانی ہی نے دیا، انسانی اشاروں کی زبان کے بعد عربی ہی تھی جو ہمارے خیالات اور افکار کی ترسیل کا ذریعہ رہی۔

چینی زبان وقت کی ایک اہم ضرورت

آج ہمارے طلبہ کو اس حیثیت سے بھی تیار کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ مختلف ممالک کا رخ کریں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آنے والے وقت میں چین دنیا کا سوپر پاور بننے جارہا ہے اس لیے خود چینی زبان کی طرف توجہ کریں اور یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے (ہمارے جو بھائی تجارتی اعتبار سے چین میں رہائش پذیر ہیں انھوں نے بتایا کہ صرف تین مہینوں میں ہی انھوں نے چینی زبان سیکھ لی بلکہ حد تو یہ ہے کہ بعض جگہوں پر ہمارے ایک عزیز امتیاز بھٹکلی جب چینی دکان داروں سے چینی زبان میں ہی بھاؤ تاؤ کرتے تو ان کی زبان کی شستگی اور روانی دیکھ کر اور انھیں کے لب ولہجے میں بات کرنے کا انداز دیکھ کر چینی دکان دار تھوڑی دیر کے لیے مبہوت ہوجاتے بالآخر اس سوال پر مجبور ہوتے کہ آپ کہاں کے ہیں اور آپ نے اتنی اچھی چینی کہاں سے سیکھی ہے)۔ ہمارے دینی مدارس کے جو طلبہ دینی اور دعوتی مزاج رکھتے ہیں انھیں اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ چین کی طرف رخ کریں اور تجارتی میدان کو اپنی جولان گاہ بنائیں،

ساتھ ہی دعوتی منصب نہ بھولیں تو امید ہے ان شاءاللہ اس کے بہتر نتائج سامنے آئیں گے۔

ہنزو ایئرپورٹ پر

اشاروں کی زبان استعمال کرتے کرتے، سیکوریٹی اہل کاروں سے پوچھتے پاچھتے بالآخر ہنزو کے لیے روانہ ہونے والے جہاز کے زیر سایہ پہنچ گئے، جہاز پر سبھی مسافر پہنچ چکے تھے، بس ہمارا ہی انتظار تھا، جوں ہی ہم نے اپنی جگہ سنبھالی، کپتان نے اڑان بھرنے کا اعلان کیا، چھینگ ڈو (Chengdu) سے ہنزو (Hanzhough) کا فاصلہ تقریباً ایک ہزار میل ہے اس لیے جہاز نے یہ مسافت پونے تین گھنٹے میں طے کی، اور ہم 2.40 پر ہنزو پہنچ گئے، یہاں سے اب ہمیں یِوُ (Yiwu) جانا تھا کیوں کہ ہمارے میزبانوں کی رہائش اور تجارتی دفاتر بھی وہیں تھے، یِوُ (Yiwu) یہاں سے لگ بھگ ایک سو تیس کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے؛ اس لیے میزبانوں کا مشورہ تھا کہ ایئرپورٹ ہی سے یِوُ (Yiwu) کے لیے بسیں چلتی ہیں، یہ کم وقت اور ''کم کرایہ'' (۶۲ یوآن-۶۲۰ ہندوستانی روپیے) میں ہم کو پہنچا دیں گی، اس لیے ہم نے اترتے ہی اپنے سامان لیے اور بس کے ٹکٹ کے لیے ونڈو کے پاس پہنچے، منزل کا نام بتایا، پیسوں کی ادائیگی کا اشارہ ہوا اور ہم نے جیب سے ڈالر (جو ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے ''نادان'' دوستوں کے مشورے سے ہم نے کچھ اپنے ساتھ رکھ لیے تھے) نکالے، مگر! یہ کیا! ڈالر بھی یہاں قابل قبول نہیں! چلیے ایک ایسی بھی جگہ اس روئے زمین پر ہے جہاں ڈالر سے کام نہیں چل سکتا- اہلیان چین کی امریکہ سے عدم مرعوبیت کی ایک اور دلیل-

خموشی گفتگو ہے، زباں بھی بے زباں ہے اور پھر اس پر یہ آفت! اب کیا کیا جائے! خود انھیں سے معلوم کیا کہ اس مسئلے کا کیا حل ہے، جواب ملا کہ ایئرپورٹ ہی پر آگے ایکسچینج کی سہولت میسر ہے، آپ وہاں سے مدد حاصل کر کے یہاں تشریف لائیں، مرتا کیا نہ کرتا! اطہر بھائی کو وہیں سامان کے ساتھ چھوڑ کر میں چلتا بنا اور کسی طرح مقصد حاصل ہو گیا اور ہمیں بس ٹکٹ خریدنے میں کامیابی ملی۔

تعجب اور استعجاب کی کیفیات کے ساتھ، تجسس بھری آنکھیں لے کر در و دیوار پر نظر

کرتے ہوئے، کھیت کھلیان کا مشاہدہ کرتے ہوئے، یہاں کے پہاڑوں کو قدرت کی طرف سے ودیعت کردہ خلعت حسن کا نظارہ کرتے ہوئے ہم بالآخر یِوُ (Yiwu) کے بس اڈہ پر پہنچ گئے، بھائی یاسر آرمار (جو یہاں کے ہمارے اصل میزبان تھے، مولانا فیصل صاحب ندوی کے عم زاد بھائی اور میرے بھائی فیصل کے قریبی دوست، جو مہمان نواز بھی ہیں، ملنسار بھی، منتظم اور مدبر بھی)، اور مولانا فیصل صاحب ندوی یہاں استقبال کے لیے موجود تھے، ملاقات ہوئی، تپاک سے ملے، رکشے والوں سے بات ہوئی، مگر ہمیں اور مولانا اطہر صاحب کو بیک وقت سوار کرنے کے لیے کوئی آسانی سے تیار نہیں ہو رہا تھا، خیر! کسی طرح ایک کو منا لیا گیا، اور ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔

بھائی یاسر کے مکان پر پہنچے تو مغرب کے لیے بہت کم وقت رہ گیا تھا، اس لیے پہلا کام جمع بین الطعامین سے قبل جمع بین الصلاتین (ظہر وعصر) کا تھا، اس سے فارغ ہوئے، اور مغرب کی نماز کے لیے نکلے، یہاں اکثر جگہوں پر ایک فلیٹ کرایہ پر لے کر وہاں آس پاس کے تاجروں نے مسجد بنائی ہے، ایسی ہی ایک مسجد میں پہنچے، کئی عربوں سے ملاقاتیں ہوئیں، یہاں عربوں کی ایک بڑی تعداد تجارت کے لیے رہائش پذیر ہے، (بلکہ بعض محلوں میں جانے کے بعد یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم چین میں ہیں، بلکہ یوں لگتا ہے کہ ہم کسی عرب ملک ہی میں ہیں کیوں کہ اکثر ہوٹلوں اور دکانوں کے سائن بورڈ عربی میں لگے ہوئے ہیں)، ان میں مصر اور یمن کے باشندے بھی ہیں، سوڈان اور صومال کے بھی ہیں، اور دیگر کئی ممالک کے مسلمان ہیں، ان سے ملاقاتیں ہوئیں، تبادلۂ خیال ہوا۔ امام صاحب لانزو کے باشندے ہیں، بڑی خندہ پیشانی سے ملے، کئی نمازوں کے لیے امامت کی پیش کش بھی کر دی، پاکستان میں کچھ وقت لگایا ہے؛ اس لیے اردو کے کچھ الفاظ بھی سیکھ رکھے ہیں، یہاں بھٹکل کے ہمارے عزیز واقارب سے بھی ملاقات ہوئی، مشورہ ہوا، اور ہمارا پروگرام ترتیب دیا گیا۔

یِوُ (Yiwu) دنیا کا ایک اہم تجارتی مرکز

آج ۲۱/ستمبر ہے، ہمارے میزبان یاسر بھائی، مولوی شاہ نواز رکن الدین ندوی

(ہمارے ہم عمر، قریبی اور مخلص دوست، فیاضی اور دریا دلی میں طاق، ہنس مکھ اور خوش مزاج، تجارت کے مقصد سے یہیں مقیم ہیں) اور بھائی عبدالباسط خطیب (ہمارے دوست مولوی عتیق خطیب کے برادرِ عزیز، اور میرے بھائی فیصل کے خاص رفیق، یہ بھی کئی مہینوں سے یہیں مقیم ہیں، اس سے قبل گوانزو میں تھے، سخی بھی ہیں، مہمان نواز بھی، خوش عیش بھی خوش مزاج بھی) آج ہمارے رہنما ہیں، سب سے پہلے یہاں کے ایک مشہور تجارتی کامپلیکس کا رخ کیا، جس کا نام Futian Market ہے، نام تو پہلے سے سن رکھا تھا مگر آج آنکھوں سے دیکھا، دیکھا تو بڑھ کر پایا، اس کی امتیازی خصوصیت دوکانوں کی غیر معمولی تعداد اور ۴/۵ کلومیٹر پر پھیلا ہوا اس کا رقبہ ہے، دوسو تین سو دوکانیں ہمیں زیادہ لگتی ہیں، مگر آج آنکھوں کے سامنے ایک ایسا ''لق و دق'' بازار ہے جو تاحدِ نگاہ بلکہ یوں کہنے کی اجازت دی جائے کہ نگاہوں سے ماورا ہے، یہاں ایک لاکھ سے زائد دوکانیں ایک ہی جگہ ایک ہی کامپلکس میں ہیں، شاید اسے دنیا کے سب سے بڑے تجارتی مراکز میں شمار کیا جائے، کہنے والے کہتے ہیں کہ اگر یہاں ایک دوکان میں دو منٹ کے لیے ٹھہر کر تمام دوکانوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی جائے تو ایک سال کا عرصہ بھی اس کے لیے ناکافی ہو جائے۔

اس کے چند ہی گوشوں کو ہم دیکھ سکے، اس لیے کہ پیروں نے ساتھ دینا چھوڑ دیا، اور وقت نے بھی اس کی اجازت نہ دی، تقریباً سبھی دوکانوں میں ہول سیل تجارت ہوتی ہے، اور سبھی چیزیں ایک ہی چھت کے نیچے جمع ہیں؛ البتہ اس کے لیے گوشے مختص ہیں، یہاں اکثر دوکان دار خواتین نظر آئیں؛ چین میں ایک تعجب خیز بات یہ نظر آئی کہ اکثر جگہوں پر خواتین کی جلوہ نمائی ہے، تہذیبِ مغرب کے جلووں نے چینیوں کو بھی اسیرِ دام بنا رکھا ہے، مساوات کے نام پر عورتوں کو بے حجاب کر ڈالا، سیماب کر ڈالا، فطری نسوانیت چھین ڈالی، جن ذمے داریوں کے متحمل ان کے دوشِ ناتواں نہ تھے وہ ان پر لاد دیے، بس ہو یا رکشہ، ٹرین ہو یا موٹر، دوکان ہو یا کھیل کا میدان، ہر جگہ عورتوں کو پہنچا دیا؛ چناں چہ عورت سب کچھ ہوگئی، عورت نہ رہی۔

یہاں کی دوکانوں میں ایک عجیب بات یہ دیکھی کہ دوکان دار خواتین ہیں، سن رسیدہ

بھی کم عمر بھی، ساتھ میں بچے بھی ہیں، نومولود بھی، ان کو پڑھا بھی رہے ہیں، کھلا بھی رہے ہیں، سو بھی رہے ہیں، سلا بھی رہے ہیں، کوئی گاہک آتا ہے تو اس سے بات بھی کر رہے ہیں اپنا کام بھی کر رہے ہیں، ایک اچھی بات یہ بھی سننے میں آئی کہ یہاں نہ صرف یہاں بلکہ پورے چین میں تجارت اس انداز میں ہوتی ہے کہ کبھی پریشانی اور بے چینی کا سایہ ان پر نہیں پڑتا، قلق واضطراب کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیتے، کھلے دل کے ساتھ تجارت کرتے ہیں، گاہک آئے تو خوش، نہ آئے تو کوئی غم نہیں، اسی لیے دورۂ قلب کا اوسط چینیوں میں نہ ہونے کے برابر ہے، یہ ایک قابلِ تقلید عمل ہے، اسی طرح یہاں دوکان داروں کے لبوں پر ہمیشہ مسکراہٹیں کھیلتی ہیں، کبھی گاہکوں پر غصہ کا اظہار نہیں کرتے، یہاں تک کہ بھاؤ تاؤ میں کبھی انتہائی کم قیمت پر بھی چیز طلب کی جائے تو بھی خفا نہیں ہوتے، ہنس کر ٹال دیتے ہیں، یہ بھی اہلِ چین کی ایک اچھی عادت ہے، جو ہمارے ملک کے پس منظر میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے، ہمارے ملک میں غصہ نہ ہونے والے کم ملتے ہیں اور یہاں پورے چین میں غصہ ہونے والے کم ہیں بلکہ ہم نے تو پورے سفر میں کسی ایک چینی کو بھی غصے کی حالت میں نہ پایا۔

یِوُ (Yiwu) اپنے تجارتی مراکز کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے، یہاں ایک خاصے کی چیز شام کے وقت لگنے والے خصوصی بازار ہیں؛ جو شبینہ بازار (Night Market) کے نام سے مشہور ہیں؛ یہاں کم قیمت پر کافی کام کی چیزیں مل جاتی ہیں، دن بھر آفس اور دیگر جگہوں پر کام کرنے والے حضرات شام کے وقت یہاں دوکانیں لگا کر دوہرا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان بازاروں کی رونق صرف شام کو ہے، دن میں اگر یہاں سے کسی کا گزر ہو جائے تو پہچاننا بھی مشکل ہو جائے کہ یہی جگہ ہے جہاں سے شام میں اس کا گزر ہوا تھا۔ یہیں ہمارے ایک دوست مولوی نسیم الریاض بستوی ندوی سے بھی ملاقات ہوئی، جو یہاں تجارت کر رہے ہیں، ہمارے درجۂ عالمیت کے بھی ساتھی ہیں، فضیلت کے بھی، پھر اس کے بعد قیامِ رائے بریلی کے دوران بھی ملاقاتیں رہتی تھی اس لیے کہ وہ مدرسہ عائشہ میں استاذ تھے، مگر اس کے بعد انھیں چین سے بلاوا آیا تو پہلے تو امامت کے مقصد سے آئے اور اب تجارت کا پیشہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔

شانگھائی کی شام

۲۲/ستمبر کا دن ہمارے پروگرام کے مطابق شانگھائی کے لیے مخصوص تھا؛ چوں کہ شانگھائی کے ہم کافی قریب تھے؛ یِؤ (Yiwu) سے وہاں کا فاصلہ تقریباً ۳۰۰ کلومیٹر کا ہے، اس لیے دل میں ایک امنگ پیدا ہوئی کہ اپنی جدت اور رونق میں اس کی ایک دنیا میں شہرت ہے، چلو ہماری بھی ایک شام شانگھائی کے نام ہوجائے، اس لیے گاڑی کرایہ پر لی گئی، اور صبح ۴۵-۸ پر ہم لوگ نکل پڑے، ڈرائیور وقت سے پہلے ہی حاضر تھا؛ اس کی وقت سے پہلے حاضری ہم ہندوستانیوں کے لیے ایک نمونہ تھی (اگرچہ کہ اس طرح کے نمونے اس سے پہلے بھی دیکھے جاچکے ہیں اور وہ بھی ہندوستانیوں کے نہیں)۔

ساڑھے تین گھنٹے میں یہ مسافت طے ہوئی اور اگلے لمحے ہم پُڈونگ (Pudong) کی جامع مسجد میں تھے، یہاں ظہر وعصر جمع تقدیم سے ادا کی گئی، نماز کے بعد وہیں کے کچھ مسلمانوں سے ملاقات ہوئی، بڑے خوش ہوئے، مسجد کی تاریخ سے متعلق ایک کتابچہ عنایت کیا، پھر حلال کھانے کی جستجو لے کر باہر نکلے تو قریب ہی ایک ہوٹل نظر آیا، ہمارے بھٹکل سے قریب مرڈیشور کے ایک تاجر سے بھی یہاں مسجد میں ملاقات ہوئی جو سعودیہ سے یہاں تجارتی میلہ میں شرکت کے مقصد سے آئے ہوئے تھے، ان کو بھی ساتھ لے کر ہم ہوٹل میں داخل ہوئے، چوں کہ آج ہمارے رہبر مولوی شاہ نواز اور امتیاز بھائی (ہمارے عزیز، کئی سالوں سے یِؤ میں مقیم ہیں، چینی اچھی بولتے ہیں اور انھیں کے لب ولہجے میں بولتے ہیں حد تو یہ کہ اب وہ اردو بھی بولتے ہیں تو چینی لہجہ صاف محسوس ہوتا ہے) تھے، ان لوگوں نے اکرام کیا، اور ہم جلد ہی فارغ ہوئے۔

شانگھائی میں مسلمانوں کی خاصی تعداد ہے؛ اگرچہ کہ یہ تعداد کم ہے پھر بھی پورے ضلع میں تقریباً سات مسجدیں ہیں، ہم لوگ قریب سے تو یہاں کے مسلمانوں کو دیکھ نہ سکے؛ اس لیے کہ یہ ایک دن میں اور وہ بھی شانگھائی جیسے وسیع ترین شہر میں ناممکن تھا، اس کا تو افسوس ہے کہ وہاں کے مسلمانوں کی سرگرمیوں کا ہم جائزہ نہ لے سکے، تاریخی طور پر تو کچھ

حالات ہم نے پڑھ رکھے تھے اور وہ کچھ امید افزا بھی نہیں تھے مگر ان کو بچشم خود دیکھنے کا موقع نہ ملا، ویسے ہمارے سفر کی اصل منزل شانگھائی تو تھی نہیں بلکہ چین کے مسلم اکثریتی علاقوں کا سفر تھا اس لیے سر دست صرف شانگھائی کے تماشائی بنے رہنے پر ہم لوگوں نے اکتفا کیا؛ اور اس مقصد کو کسی اور وقت کے لیے ٹال دیا- ان شاء اللہ-

آبادی کے اعتبار سے شانگھائی اس وقت دنیا کے سب سے بڑے شہر کے طور پر ابھر رہا ہے، آبادی کا آنکڑہ تو تقریباً پونے تین سے تین کروڑ کو چھو رہا ہے مگر اس میں مسلم تناسب بہت ہی کم ہے، مسجدیں بھی پورے شانگھائی میں صرف سات/ ۷ ہیں، البتہ مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لیے ایک ثقافتی تنظیم (چائنا کلچرل ایسوسی ایشن) ہے جو سرکار کی منشا کے مطابق کام کرتی ہے، مسلمانوں کو قومی دھارے میں شامل کرنے کے لیے اسے قائم کیا گیا ہے، تاریخی طور پر بعض ادوار میں اس کا موقف بھی کچھ متنازع رہا ہے، جس کا کچھ تذکرہ ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی نے اپنے سفر نامہ (دیوارِ چین کے سائے میں) میں کیا ہے، اور آج بھی دینی حلقہ اس کی سرگرمیوں کو تحفظات کے ساتھ ہی دیکھتا ہے۔

مشرقی چین کے سرے پر واقع کچھ جنوب کی طرف مائل شانگھائی کا شہر دنیا کے خوب صورت ترین اور دوسری طرف جدید ترین شہروں میں سے ایک ہے، یہاں کے در و دیوار، یہاں کے گنبد و مینار دل فریب بھی ہیں جاں نواز بھی، فرحت بخش بھی ہیں جاذب نظر بھی، ہر چٹکنے والا غنچہ حسین، ہر کھلنے والی کلی قدرتی حسن سے رنگین، اس کی صبح جاں فزا، اس کی شام دل ربا، ہماری ساعتوں سے صبح بنارس اور شام اودھ کے تذکرے ٹکرائے ہیں اور چشمِ تصور نے اس کے پرلطف نظاروں کی سیر کی ہے، اور کچھ افسوس بھی رہا ہے کہ اس کا دیدار نہ کرپائے اور آج گردش لیل ونہار نے اسے قصۂ پارینہ بنادیا، مگر شانگھائی کی شام جو دیکھی تو پھر شہبازِ خیال نے اس کی فضاؤں میں پرواز کرنا شروع کیا، اور اب احساس نے شامِ اودھ کے تذکرے بھلادیے، مگر کیسے! یہ تو دنیا ہے، یہ اتنی حسین اور پرلطف ہے (اور جب کہ یہ فانی بھی پھر اس سے جی لگانا کیسا) تو پھر میرے رب کی بنائی ہوئی ابدی جنت اور سرمدی نعمت کے حسن کا کیا عالم ہوگا! سچے پیغمبر نے تو صاف بتادیا کہ ﴿أعددت لعبادي الصالحين ما لا عين رأت

ولا أذن سمعت ولا خطر علىٰ قلب بشر ﴾(حدیث قدسی)''میں نے اپنے وفادار نیک بندوں کے لیے ایسی جنتیں اور نعمتیں تیار کر رکھی ہیں کہ نہ کسی آنکھ نے اس کا نظارہ کیا ہوگا، نہ کسی کان سے اس کا تذکرہ گذرا ہوگا، اور نہ ہی کسی انسان کے دل پر اس کا خیال بھی آیا ہوگا۔''

رم جھم رم جھم بارش، مستانہ ہواؤں کے جھونکے، لالہ و یاسمیں کا رقص، سرو و شمشاد اپنے جوبن پر، بادِ نسیم مشک بار، جیسے ہوا کے رخ پہ کھلی زلفِ یار، فصلِ بہار کی لطافتیں، گوہر آب دار کی نزاکتیں، شبنمی موتیوں کی پھواریں، رنگ و نکہت کی برساتیں، فضائیں معطر، ہوائیں معنبر، اور نظروں کے سامنے دودھیا روشنی میں نہاتا ہوا اورینٹل پرل ٹاور، ایسے میں وجدان جھوم کر خالق کی تسبیح پر مجبور، زبان پر حمد کے زمزمے آئیں، بربطِ دل پر احساس کے سُر پر ثنائے خالق کے نغمے لہرائیں، کائناتِ حسن کے مصور نے آدم کے اس بیٹے کو کیسا خوب صورت دماغ عطا کیا، جس نے اپنے وجود میں قدرت کی طرف سے ودیعت کردہ اعلیٰ ترین صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر دنیا کو حسن اور رعنائی سے بھرپور شاہکار دیے، انھیں میں ایک یہ پرل ٹاور ہے، جس کا ایک جلوہ ہم نے دن میں بھی دیکھا جب گھٹاؤں نے پہرہ کر رکھا تھا اور اپنے ہاتھوں میں اس کے رخِ زیبا کو چھپا رکھا تھا، پہلو ہی میں بے شمار سنتری بھی تھے جو دیو قامت روپ دھار کر اس کی حفاظت کا فرض ادا کر رہے تھے، ان میں سے ہر ایک کا رنگ بھی جداگانہ تھا؛ آہنگ میں بھی یکتائے زمانہ تھا، موتیوں کے دانے نگینے کی رونق میں اضافہ کر رہے تھے، بادلوں کی اوٹ سے کبھی جلوہ دکھا کر کبھی پردہ گرانے کا، کبھی گھونگھٹ اٹھا کر کبھی شرما جانے کا منظر بھی بڑا دل فریب تھا؛ دامن دل کھنچا جا رہا تھا، مگر شام کا جو منظر تھا وہ سب سے جدا اور یہ رنگ سب رنگوں سے نرالا تھا، ایک طرف چاند کا جلوہ، روشنیاں بھی شباب پر، قمقمے بھی بلندیوں پر رنگ و نکہت برساتے ہوئے، اور سامنے اسی کے پہلو میں مشامِ جاں کو مہکانے والا جاں فزا دریا (Huangpu) محوِ خرام، اس کے سینے کو چیرتی اس کی موجوں سے اٹھکیلیاں کرتی گاہ بگاہ ٹکراتی کشتیاں۔ اختر شیرانی کو میں اس موقع پر اپنے دل کا ترجمان پا رہا تھا اور ان سے یہ اشعار مستعار لے رہا تھا جو انھوں نے گنگا کی شان میں کہے تھے:

یہ بکھرے ہوئے پھول یہ نکھرے ہوئے تارے
خوشبو سے مہکتے ہوئے دریا کے کنارے
یہ چاندنی رات اور یہ پر خواب فضائیں
اک موجِ طرب کی طرح بے تاب فضائیں
سبزے کا ہجوم اور یہ شاداب فضائیں
مہکے ہوئے نظّارے ہیں، بہکے ہوئے تارے

یہ تارے ہیں یا نور کے پیمانے ہیں روشن
معصوم گل اندامون کے کاشانے ہیں روشن
مستانہ ہواؤں پہ پری خانے ہیں روشن
یا دامنِ افلاک میں بے تاب شرارے

مہتاب ہے یا نور کی خوابیدہ پری ہے
الماس کی مورت ہے کہ مندر میں دھری ہے
مرمر کی صراحی مئے سیمیں سے بھری ہے
اور تیرتی ہے نیل کی موجوں کے سہارے

نیندوں میں ہیں کھوئی ہوئی بیدار ہوائیں
گلزار ہیں گلریز و گہربار ہوائیں
ہیں نور میں بھیگی ہوئی سرشار ہوائیں
یا بال فشاں مستی و نکہت کے نظارے

ساحل ہیں کہ خوابیدہ نظاروں کے شبستاں
دامن میں لیے چاند ستاروں کے شبستاں
فردوس کی مستانہ بہاروں کے شبستاں
اختر کی تمنا ہے یہیں رات گزارے

رکیے تو! ابھی اتنے ہی پر یہ حال ہوا جاتا ہے، ابھی آپ کو بہت کچھ دیکھنا ہے، یہ تو ایک ہی نہر ہے، وہ بھی دنیائے دَنی کی، میرے رب نے تو بے حد وحساب نہریں بہائی ہیں اپنی حسین جنت میں، یہ تو ایک باغ دو باغ ہیں دنیا کی چھاتی پر، میرے رب نے تو اَن گنت باغ لگائے ہیں اپنی پیاری جنت میں، یہ تو دریا ہے صرف پانی کا، میرے رب کے وفاداروں کی جنت میں بے شمار نہریں ہوں گی پانی کی، وہ بھی صاف وشفاف، ہر تکدر سے پاک، اور ہر آلائش سے صاف، شہد کی نہریں؛ خالص اور شیریں، دودھ کی نہریں؛ خوش گوار اور لطیف ترین، شراب کی نہریں؛ پاکیزہ اور لذیز ترین، نہ خیال بہکے، نہ دماغ مچلے، نہ دامانِ قلب ونگاہ آلودہ ہو، نہ ہَوا وہوس کے لیے جذبات میں ابال پیدا ہو، اور وہ شراب بھی خالق کائنات کے ہاتھوں! واہ کیا لذت ہے اس کی! کیا مزہ ہے اس کا! ایسی لذت جس کے سامنے دنیائے دَنی کی ہر لذت ہیچ، ایسا مزہ جس کا تصور بھی اب تک نہ کیا، واہ! کیا نشہ ہے کیا سودا ہے اس میں، ایسی مدہوشی جو ہوش کے لیے سرمایۂ نازش، ایسا سودا جو عقل کے لیے طغرائے افتخار کہ آج حریم قدس میں باریاب ہو کر باغِ ارم میں اور جناتِ عدن میں، گھنیری چھاؤں میں اور ابد کی راہوں میں بادۂ الست سے مخمور ہو رہے ہیں، جام فضاؤں میں لہرائے جارہے ہیں، فضائیں مہکائی جارہی ہیں کہ آج ساقیِ ازل کے ہاتھوں شرابِ طہور پلائی جارہی ہے اور زندگی بھر کے ارمان پورے ہو رہے ہیں کہ آج وفاؤں کا صلہ دیا جارہا ہے، اور خمخانۂ ازل کے ساغر ومینا گردش میں ہیں اور سرمدی سلسبیل سے ساقیِ کوثر جام کے جام لنڈھا رہے ہیں۔

بیٹھا رہوں تصورِ جاناں کیے ہوئے

اس لیے ؎

رہنے بھی دو ساغر ومینا مرے آگے

آج رہ رہ کے یہی تمنا دل میں انگڑائی لے رہی ہے کہ ؎

سحر کی بات چلے اور نہ ذکر شام چلے
یہ کہہ رہی ہے گھٹا آج دورِ جام چلے

اور شاعر کی روح سے معذرت کے ساتھ...

تری نگاہ کے ساغر ہی صبح وشام چلے
یہی ہماری تمنا ہے یہ مدام چلے

میں الفاظ کہاں سے لاؤں! میرے پیارے رب کی پیاری جنت ہے ہی ایسی حسین کہ اس کے حسن کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا، اس کو الفاظ کے پیکر میں ڈھالا نہیں جاسکتا، بس چشم تصور سے کچھ سوچا جاسکتا ہے، توبہ! سوچا بھی تو نہیں جاسکتا! سوچوں سے بھی تو پرے ہے اس کا حسن، عقلوں سے بھی ورے ہے اس کا جمال۔

اس کی جنت اتنی حسین ہے تو اس کی ذات کتنی حسین ہوگی، عقل کو یارا نہیں کہ حسن ازل کو سوچے! الفاظ کو ہمت نہیں کہ اس کا نقشہ تراشے! زبان کو تاب نہیں کہ لفظ وبیاں کا سہارا لے، نظر کو قوت نہیں کہ ادراک کرے۔

نہ ہے تابِ سخن مجھ کو نہ ہے تقریر کا یارا
میں ذرّہ ہوں میرا موضوع خورشیدِ جہاں آرا

بس زبانِ نبوت نے ترجمانی کی: ''نورٌ أنّیٰ أراہ'' (وہ سراپا نور ذات کہاں میری نگاہوں میں سما سکتی ہے)، ''لو کشف النور لأحرقت سبحات وجهه ما انتهىٰ اليه بصره من خلقه'' (وہ نورانی پردوں میں مستور ہے، اگر وہ نور کا جلوہ دکھا دے تو اس کی نوری کرنیں تا حد نگاہ کو جلا کر خاکستر کردیں)۔

کائنات حسن جب پھیلی تو لامحدود تھی
اور جب سمٹی تو تیرا نام ہو کر رہ گئی

بَنڈ (وائی تھنگ) یعنی دریا کے کنارے انھیں پاکیزہ ومنور خیالات میں گم رہے، رنگ برنگی مست رُتوں کے لمحوں سے محظوظ ہوتے رہے، پرل ٹاور اپنی بلند ترین چوٹی سے نئے نئے رنگ میں جو جلوے دکھا رہا تھا ان کو دیکھ کر جھومتے رہے، جو نور برسا رہا تھا اس میں نہاتے رہے، حسن وجمال کی اس دنیا کو دیکھ کر زبان بھی خالق کی حمد وثنا میں تر تھی، دل بھی یادِ خدا میں محو

تھا کہ اچانک دنیا کے حسن بے پروا کو بے حجاب دیکھا، شوخ بجلیوں کو بے تاب دیکھا، بت کافر ادا کو بے نقاب دیکھا، تہذیب مغرب کی تجلیوں نے زینت درون خانہ کو شمع میخانہ اور اس کے حسن کی دولت کو صلائے عام بنادیا کہ آج دولت حسن کی سودائی نازنینیں اپنی قیمت پہچان کر حیا کے دبیز پردوں میں اپنے آب دار موتیوں کو چھپانے اور زمانے کی نظروں سے ان کو بچانے کے بجائے سرِ عام بیچنے نکلتی ہیں اپنے حسن کی جاگیر کو اور دعوت نظارہ دیتی ہیں ہر رہ گیر کو، انسانیت کے قاتلوں نے حوا کی بیٹی سے اس کی غیرت کا غازہ چھینا، اس کے لباس حیا کو نوچا، اس کے دامن انسانیت کو تار تار کیا، عزت وعصمت کے لٹیروں کو تماشائی بلکہ شیدائی بنادیا، حد تو یہ کہ دنیا کا چپہ چپہ مغرب کی زلف گرہ گیر کا اسیر اور اس کے دامِ فریب کا نخچیر ہوگیا، نہ یورپ بچا، نہ ایشیا، نہ ہندوستان بچا، نہ انگلستان، یورپ کے منادی نے پتہ نہیں کون سا صور پھونکا اور مغرب کے سامری نے معلوم نہیں کون سا منتر کانوں میں پڑھ دیا کہ جس چین کو اپنی ثقافت پر ناز ہے بلکہ دنیا کے جس بڑے حصے کو اپنی روایات اور اپنی زبان پر ناز ہے اسی نے تہذیب مغرب کے معاملے میں آخر کیوں تعصب کا ثبوت نہیں دیا اور اس کی اخلاق سوز، حیا سوز اور ایمان سوز ثقافت کو بنا سوچے سمجھے کیسے گلے لگالیا، چین کی وادیوں کا چکر لگائیے، یہاں کی گلیوں میں گھومیے، یہاں کے بازاروں کا گشت لگائیے آپ کو یورپ سے کچھ کم تھوڑی دکھائی دے گا! ہر چیز میں یورپ کی ریس، بلکہ آگے بڑھ کر اس کا اظہار کہ ہم بھی کسی سے کم نہیں۔

شانگھائی کی سڑکیں، اس کے چوراہے، بالخصوص پرل ٹاور کے سامنے کا چوراہہ خوب صورتی کا اعلیٰ شاہکار اور دل کشی اور رعنائی سے مالا مال تھا، قرینے سے سجے ہوئے پھول چمن کی رونق میں اضافہ کررہے تھے، شام کے وقت شانگھائی کے قدیم بازار میں جانا ہوا، کسی چڑیا گھر کی تلاش تھی، مگر رہبروں کو اس تک پہنچنے میں کامیابی نہیں ملی؛ اس لیے بس چشم تصور سے اس کے تماشائی بنے رہے، مگر اسی بہانے ترکی آئس کریم اور اس کے دوکان دار کی خوش مزاجی کے مشاہد بنے۔ پھر ایک قدیم مسجد کی تلاش شروع ہوئی، ابھی مغرب میں ایک گھنٹے سے زائد کا وقت تھا اور یہاں کے ٹرافک اصولوں کے مطابق ہماری گاڑی کو اپنی جگہ سے ٹلنے کی اجازت نہیں تھی؛ کیوں کہ شام ۴-۰۰ تا ۷-۰۰ کا وقت شانگھائی کے

باسیوں کے لیے مخصوص ہے اور انھیں کی سواریوں کا اس کا حق حاصل ہے کہ فراٹے بھریں اور یہاں کی سڑکوں کو روندیں، اس کے علاوہ کسی شہر کی سواری کی مجال نہیں کہ پارکنگ سے ہٹے ورنہ بڑے بھاری ہرجانے کے لیے تیار ہوجائے۔

ایک قدیم مسجد

آدھے گھنٹے کی تلاش کے بعد ہم ایک قدیم مسجد کے سامنے تھے جو چینی آرٹ کا نمونہ تھی، کشتی نما نقش ونگار سے تقریباً چین کی قدیم سبھی عمارتیں مزین نظر آتی ہیں، اور یہ یہاں کا ایک خصوصی امتیاز ہے۔ یہ مسجد کوئی تین چار سو سال پرانی تھی، جس کے محراب اور در بھی دل کش اور جاذب نظر تھے اور قدیم نقش ونگار کا نمونہ تھے، تھوڑی دیر ستا لینے کے بعد مغرب کی تیاری کی، پھر نمازوں سے فارغ ہوئے، ابھی سواری کو پروانۂ راہداری نہیں ملا تھا، اس لیے تھوڑی دیر چہل قدمی کی، پھر اس پر سوار ہوئے اور بقیہ مقامات کی زیارت کے لیے نکل پڑے، بَنڈ سے نجنگ لُو کی تلاش میں نکلنے کا منظر بھی بھلائے نہیں بھولے گا اس لیے کہ اس کے لیے جسم کی جو ریاضت شروع ہوئی اور پیروں کو اذنِ عام جو ملا وہ دو سے زائد گھنٹوں اور چھ/ سات کلو میٹر کے بعد ہی اختتام کو پہنچا؛ واپسی میں ہمت نہیں تھی کہ پھر یہ تجربہ دہرائیں اس لیے ننھے سے ٹرام کا سہارا لے کر واپس ہوئے؛ جو مقصد کو بھی پورا کررہا تھا اور لطف بھی پیدا کررہا تھا۔

شانگھائی سے واپسی پر ایک بات سن کر عجیب حیرت ہوئی کہ ایک روز کے لیے جو سواری ہمارے میزبان یاسر بھائی نے کرایہ پر لی تھی اس کا کرایہ ۱۶۰۰ یوآن (تقریباً ۱۶۰۰۰ ہندوستانی روپیہ) تھا؛ پھر بعد میں پتہ چلا کہ یہ تو ایک عام معمول ہے اور یہاں مواصلات کے اخراجات کافی بڑھے ہوئے ہیں؛ ہر کس وناکس کے بس کا نہیں کہ وہ کرایہ پر سواری لے، اور اس مہنگائی کی ایک بڑی وجہ یہاں کی وسیع وعریض اور جدید سے جدید شاہراہوں پر لگے ٹول ہیں، جس کا ادنیٰ مظاہرہ شانگھائی کے اسی مختصر سفر میں ہوا کہ تقریباً ۶۰۰/ ۷۰۰ یوآن اسی ٹول کی نذر ہوگئے۔ ہمارے ایک عزیز مدثر محتشم (جو گوانزو میں مقیم ہیں، وہیں بڑے وسیع پیمانے پر تجارت کرتے ہیں، مولوی یوشع ندوی کے بھائی ہیں، دین اور اہل دین

کے قدر دان ہیں، ہمارے سفر کے اخیر میں عید کے روز یہیں یِوٗ میں ان سے ملاقات بھی ہوئی) نے بتایا کہ ایک بار وہ اپنی سواری پر گوانزو سے یِوٗ آئے تھے، دونوں کے درمیان لگ بھگ ۱۵۰۰ کلومیٹر کا فاصلہ ہے، راستے میں مختلف ٹول پر انھیں ۱۲۰۰ یوآن سے زائد لٹا کر آنا پڑا۔ بسوں اور ٹرینوں کا کرایہ بھی کافی مہنگا ہے، یہ الگ بات ہے کہ جتنا کرایہ زائد ہے اتنی وافر سہولتیں بھی مہیا کی گئی ہیں؛ اس کا ہمیں اپنے سفر کے اگلے مرحلوں میں تجربہ ہوا۔

اگلا پڑاؤ

۲۳/ستمبر کا دن بھی یِوٗ کے نام رہا، یہاں کے مختلف بازاروں کی سیر کی، جن میں تائیورسٹی اور گارمنٹ مارکیٹ وغیرہ قابل ذکر ہیں؛ اپنے میزبانوں کی ضیافت سے لطف اندوز بھی ہوتے رہے، یاسر بھائی کے ساتھ ساتھ جناب رفیع کولا (جو اطہر بھائی کے ماموں ہیں، اتفاق سے ہمارے بھی شناسا نکلے، یہیں مقیم ہیں، بلکہ شاید چین میں احبابِ بھٹکل کے السابقون الاولون میں سے ہوں گے، کافی ملن سار اور مہمان نواز بھی ہیں) نے بھی پورا حق ادا کیا، عبد الباسط بھائی اور مولوی شاہ نواز نے خوب خوب اپنا وقت دیا، اور جامع مسجد کی بھی سیر کرائی۔

یہ دن چین میں خصوصی تفریح کے تھے، ۵-۱۱ اکتوبر اہل چین کے قومی ایام ہیں؛ جن میں یہ حضرات سیر وتفریح کے لیے مختلف مقامات کا سفر کرتے ہیں، اس لیے ہم لوگوں کو اپنے اگلے پروگرام کو مرتب کرنے میں کافی دشواری ہوئی، خواہش تھی کہ ٹرین سے سفر کیا جائے، مگر ریزرویشن نہیں مل سکا اس لیے مجبوراً جہاز کا ٹکٹ لینا پڑا، ترتیب شدہ پروگرام کے مطابق ہمیں پہلے لانزو جانا تھا؛ جہاں ہمارے سفر کے اصل رہنما مولوی عادل تبّتی کو ہمارے قافلے میں شامل ہونا تھا؛ ان سے فون پر بات ہوئی، اور وہ قربانی دیتے ہوئے پہلے سے بنے ہوئے ٹرین کے ٹکٹ کو کینسل کر کے (۱۷۰۰/ یوآن خرچ کر کے) براہِ جہاز ہم سے پہلے ہی لانزو پہنچ گئے۔

۲۴/ستمبر شام کے تقریباً چھ بجے یِوٗ ایئرپورٹ سے حینان ایرلائنز کے طیارے پر سوار ہوئے، یہاں ایئرپورٹ پر کچھ عرب تاجروں سے ملاقات ہوئی، علیک سلیک ہوئی، اپنے حلیہ سے ہم لوگ بھی عرب تھے، اور چین میں تقریباً ہر جگہ بالخصوص پبلک مقامات پر اسی حیثیت سے

ہم لوگ پہچانے گئے، اَلُپُو، اَلُپُو کی آوازیں ہمارے کانوں میں پڑتیں اور جہاں ممکن ہوتا' رک کر ہم لوگ اپنا تعارف اِنڈُو (یعنی ہندوستانی) کہہ کر کراتے، ان عربوں سے گفتگو ہوئی، اندازہ ہوا کہ چین کی دینی فضا سے متعلق ان میں بے چینی اور فکر پائی جاتی ہے، ہم لوگوں نے بھی ان کو بحیثیت امتِ محمدیہ اپنے فرض منصبی کی طرف توجہ دلائی اور اس طرح تھوڑی دیر دینی مذاکرہ رہا۔

دو گھنٹے جہاز نے مسافت طے کی، حینان کی مہمانی سے ہم اور اطہر بھائی مستفید ہوئے جب اس پر "الأطعمة الاسلامية" کا لیبل چسپاں دیکھا، مولانا فیصل صاحب تو پھر بھی کنارہ کش ہی رہے، بعد میں متفکر چینی مسلمانوں سے ملاقات پر معلوم ہوا کہ مولانا فیصل صاحب کی رائے ہی تقویٰ کے زیادہ قریں ہے۔

سفر میں مولانا فیصل صاحب کی ایک اور خصوصیت کی قدر آئی، اور وہ ہے وقت کی قدر و قیمت کو پہچان کر اس کی پائی پائی کو وصول کرنا؛ جب ہی تو علم وتحقیق کے وہ شناور بنے اور اس بحر سے غواصی کر کے لؤلوئے لالا نکالے اور اس کی چمک دنیا کو دکھائی اور (چشم بد دور) اب بھی دکھا رہے ہیں؛ خدا ان کی عمر میں برکت دے اور خوب سے خوب ان سے کام لے، اور ہمیں بھی وقت کی قدر اور اس کے صحیح استعمال کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

تھوڑا تھوڑا سمجھ کر کتنا وقت ہم لوگوں کا بے کاری کی نذر ہو جاتا ہے حالاں کہ قطرے قطرے سے ہی دریا بنتا ہے، کہنے کو تو یہ مثال دیتے دیتے ہماری زبانیں نہیں تھکتیں مگر جب اس کو برتنے کا وقت آتا ہے تو یہی بات پتہ نہیں کیوں ہماری سمجھ میں نہیں جاتی۔ پورے سفر میں مولانا کو دیکھا کس طرح ایک ایک لمحے کی قدر کی، دو منٹ بھی ملے بلا مبالغہ اس کی بھی قدر کی، فوراً ڈائری لی اور لکھنا شروع کر دیا، ہوائی جہاز کی ابھی ایئرپورٹ پر لینڈنگ ہو چکی ہے، پائلٹ نے اعلان بھی کر دیا ہے، جہاز رک بھی چکا ہے، مگر دروازہ کھلنے میں دو چار منٹ باقی ہیں، مولانا کو اور کیا چاہیے بس ڈائری اٹھائی اور اپنا کام شروع کر دیا؛ میزبان رخصت کرنے کے لیے آچکے ہیں، سامان سواری پر لد رہا ہے، روانگی کے لیے سیٹی بج چکی ہے، ہوٹل سے سامان اتارا جا رہا ہے، ابھی کتنا وقت ہی اس کے لیے درکار ہے، مگر مولانا کو بس

ایک ہی دھن ؛ پڑھنے کی لکھنے کی ،الغرض کوئی ساز مان ہوا اور کوئی سا مکان ؛ مولانا کو کوئی تکلف نہیں اپنا کام کرنے میں ؛ یہ بڑی قابلِ تقلید صفت دیکھی ہم نے ۔

شی آن (یہاں پر ان شاء اللہ واپسی میں ٹھہریں گے) میں جہاز کو اتر کر پھر لانزو کے لیے اڑان بھرنی تھی، اس لیے دو گھنٹے میں بؤ سے شی آن پہنچے، یہاں سے لانزو کی مسافت مزید ایک گھنٹے کی تھی؛ اس لیے جلدی سے ہم لوگ ضروریات سے فارغ ہوکر پھر طیارے پر سوار ہوئے، اور گھنٹے بھر کی مسافت طے کرنے کے بعد لانزو کے ہوائی اڈے پر اترنے کا اعلان ہوا۔

اترتے وقت لانزو کے فضائی نظارے سے کچھ صحیح اندازہ نہیں ہو پایا اسی لیے لانزو کو غلط فہمی سے ہم محدود آبادی والا شہر سمجھ بیٹھے، مگر بعد میں پتہ چلا کہ یہ صرف ہمارا خیال خام تھا، یہ کافی قدیم اور گنجان آبادی والا شہر ہے، مگر ہوائی اڈے سے شہر کی دوری تقریباً ستر کلومیٹر کی ہے، اس لیے پہلے پہل ہم لوگ اندازہ نہیں کر پائے۔

جیسے ہی ہوائی اڈے سے باہر نکلے ہمارے خصوصی میزبان مولوی عادل تبّتی کچھ نئے چہروں کے ساتھ نظر آئے جن پر نور تھا، آنکھوں میں سرور تھا، میزبانوں کا قافلہ تین افراد پر مشتمل تھا؛ ایک خود مولوی عادل تبّتی، دوسرے شیخ داؤد صالح (شیئنگ)، تیسرے ان کے نوخیز صاحب زادے حافظ نقی۔

جب ان کی یاد آئی آنسو چھلک پڑے

جیسے ہی مولوی عادل پر نگاہ پڑی ؛ ذہن میں یادوں کا ایک خوش گوار سفر شروع ہوا؛ حافظے نے پرانی یادیں تازہ کردیں، خیالوں کا پنچھی اڑتے اڑتے میرے مربی مرحوم مولانا عبداللہ حسنی مرحوم کی مجلسوں میں جا پہنچا، علم وعرفاں کی مجلسیں، نورِ ایقاں کی محفلیں، شمعِ ایماں کی رونقیں، جہاں سوز وساز ملتا، قلب کو گداز ملتا، نظر کو نور ملتا اور دل کو سرور، خیال کو پاکیزگی ملتی اور روح کو بالیدگی، فکر کو سلامت روی ملتی اور زندگی کو ثابت قدمی، جہاں اتباعِ سنت کے فانوس جلتے، آنکھوں میں احیائے اسلام کے خواب سجتے، دلوں میں خفتہ عزائم بیدار ہوتے، خوابیدہ جنوں جاگ اٹھتا، علم کے چرچے، اللہ کے نیک بندوں کے تذکرے، اصلاحِ باطن

کی فکر، اسلام کے فروغ کی کوشش، کچھ کر گذرنے کا عزم لے کر ہر حاضر باش اٹھتا، اپنے مسائل مولانا کی خدمت میں رکھتا اور تسکینِ قلب وجاں کے دو بول لے کر ہی واپس لوٹتا۔

توحید خالص کے علم لہرا کر، سنتوں کی خوشبو مہکا کر، محبت خداوندی کی جوت جگا کر، عشق الٰہی کی سبیل لگا کر، دلوں کی سرد انگیٹھیاں گرما کر، جہانِ قلب کو آباد کر کے، ایمان کی شمعیں فرزاں کر کے، حسنِ عمل کی قندیلیں روشن کر کے، وفا کے گیت گا کر' گزرنے والے راہِ وفا سے گزر گئے، اور کتنوں کو راہِ وفا پر لگا گئے، رضائے مولیٰ کے سبق سکھا گئے، سرفروشی کے جذبے دلا گئے، زندگیاں بنا گئے، اخلاق سنوار گئے، جو کسی کام کے نہ تھے ان کو بھی بفیضِ خدا رشکِ مسیحا بنا دیا، دنیا والوں نے جنھیں کسی لائق نہ سمجھا بلکہ اچھے اچھوں نے ناامیدی ظاہر کی، مولانا کے فیضانِ نظر سے وہ بھی یقیں کی راہ پہ چل پڑے اور آج ہوائے تند وتیز میں چراغِ ایماں جلا رہے ہیں۔

اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی
ہم نے تو دل جلا کے سرِ عام رکھ دیا

راہِ وفا کے یہ راہی اور لشکرِ اسلام کے یہ سپاہی اپنے آشیانے پھونک کر زمانے کو روشنی بخشنے کا عزمِ جواں رکھتے ہیں، کشتیاں اپنی جلا کر خورشید اسلام کی نور افشانی کی راہ تکتے ہیں، کسی طرح پیغامِ محمدی کو دنیا کے چپے چپے تک پہنچانے کا حوصلہ اپنے سینوں میں رکھتے ہیں؛ خدا ان کے ولولوں کو ہر دم جواں رکھے، ان کی سرگرمیوں کو پیہم رواں رکھے، زمانے کے شرور اور فتن سے ان کی مکمل حفاظت فرمائے، اور ان کے پیش رو جو دنیا سے رخصت ہو چکے اور اپنی کوششوں کا ثمر دیکھنے کے لیے آج وہ اس روئے زمین پر موجود نہیں اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رضا سے نوازے اور اپنی مغفرت کے سائے میں اور رحمت کی آغوش میں لے لے اور اپنے شایانِ شان اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

خوش قسمتی ہے مولوی عادل کی کہ ان پر بھی مولانا کی نگاہِ التفات پڑی، اور وہ بھی اسی

سفرِ نور پر چل پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں پہنچ گئے جہاں تک پہنچنے کی ہم جیسے لوگ بس آس ہی کر سکتے ہیں۔

ہم لوگوں کے سامنے ان کی زندگی کا ایک وہ رخ بھی ہے جو ان کی ندوے کے زمانۂ طالب علمی کے ابتدائی ایام کا ہے، جب وہ ایسے تھے کہ ان سے خود ان کی صورت پہچانی نہیں جاتی تھی...اور پھر دعوت وتبلیغ کی محنت اور ہمارے مولانا کے دامن فیض سے ایسے وابستہ ہوئے کہ آج وہ ''عہد رفتہ'' کی طرف جھانکنا بھی پسند نہیں کرتے اور کسی موڑ پر رک کے بغیر روشنیوں کے سفر میں آگے نکل جانا چاہتے ہیں، اللہ انھیں اس میں کامیاب فرمائے، عمر ابھی کوئی تیس سال ہے لیکن اللہ تعالیٰ ان سے اپنے سینکڑوں بندوں کی ہدایت کا کام لے رہا ہے۔

مولوی عادل کو دیکھ کر میرے مولانا بہت یاد آئے کہ آج وہ ہوتے اور اپنے ہاتھوں لگائے ہوئے اس پودے کو دیکھتے یا لشکرِ اسلام کی اس تازہ تگ وتاز کی خبریں سنتے تو بے انتہا خوش ہوتے اور اپنے خاص انداز میں فرماتے: ''خوب''۔ یہ خبریں واقعی مولانا کے دل کو خوش کر دیتیں؛ کچھ ہم نے بھی دیکھی ہے مولانا کی بے چینی؛ جب امت کے حالات سن کر آپ کا دل رنجور ہو جاتا اور تڑپ تڑپ اٹھتے، کبھی کہنے لگتے: ارے! کچھ اچھی سی خبریں سناؤ بھائی! بہت سن لئے یہ مسائل وہ مسائل، اب سناؤ کسی کے اسلام لانے کی خبریں۔

بہت خوشی کی بات ہے کہ آپ کے فیض کا سلسلہ اب ہندوستان کی سرحدوں سے آگے بڑھ کر چین تک پہنچ چکا ہے اور کفر وظلمت کے اندھیروں کو ایمان ویقین کی روشنی سے منور کر رہا ہے۔

....اک کلیم سر بکف

لاکھ حکیم اصلاحِ احوال کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیں اور ہزار نسخے اپنالیں، مگر کام تو اسی سے ہوتا ہے جو سر بکف میدان میں دیوانہ وار کود پڑتا ہے، اس کو نہ اپنے کھانے کی فکر ہوتی ہے نہ پہننے کی، نہ ٹھکانے کا اسے پتہ نہ ہوش اپنی زندگی کا، وہ تو بس ایک ہی سودا سر میں رکھ کر نکلتا ہے اور مارا مارا پھرتا ہے ایک ہی دھن میں، ایک ہی تڑپ لے کر؛ کسی طرح امت ہدایت پا جائے،

صحیح راستے پر آجائے، گم راہ انسانیت اپنے رب سے رشتہ جوڑ لے، اپنے خالق کی معرفت حاصل کر لے، اپنے مالک کو پہچان لے، بھٹکا ہوا آہو سوئے حرم چل پڑے اور حرم کی فضاؤں میں پہنچ کر سکون پائے، آج ضرورت اسی کی ہے کہ سر بکف ہو کر کارزارِ حیات میں گھس جانے والے اور زندگی کی کشت زار کو اسلام کے چشمۂ حیواں سے سیراب کرنے والے پیدا ہوں۔

کوئی جا کر دیکھے چین کی گلیوں میں، کوئی جا کر دیکھے روس کی سڑکوں پر، کوئی جا کر دیکھے یورپ کے بازاروں میں، کوئی رخ کرے مشرق بعید کا، کوئی چکر کاٹے مغرب کے آخری سرے کا' ہر جگہ اسے کچھ ایسے ''دیوانے'' ضرور نظر آئیں گے جو سرد وگرم کی پروا کیے بغیر باطل کے سیلابِ بلاخیز کے آگے بندھ باندھنے کے لیے جاں توڑ کوششیں کر رہے ہیں؛ دشمن کی سینکڑوں سازشوں کے باوجود وہ دیوانہ وار میدانِ دعوت میں سرگرم ہیں، مظالم کی چکی میں پس پس کر ان کا ایمان نکھر رہا ہے، اور انھوں نے ایمان ویقیں کی دعوت ہی کو اپنے لیے اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے، اسی کے لیے جیتے ہیں اور اسی کے لیے مرتے ہیں، اور ان کوششوں میں سب سے نمایاں اور سب سے زیادہ حصہ دعوت وتبلیغ کی محنت کا ہے، چین کے اس سفر میں بھی ہم نے اس کی برکتوں کا کھلے آنکھوں مشاہدہ کیا، جو دین کی بیداری نظر آرہی ہے وہ اسی کا فیض ہے، ورنہ سب کی اپنی اپنی دنیا الگ بسی ہوئی ہے، ہر ایک اپنے کام میں مشغول اور اسی کو اپنا مقصد حیات سمجھے ہوئے ہے، دسیوں سال سے جو ظلم وستم کی داستان دہرائی گئی اور اب بھی شمالی چین کا ایک صوبہ اس سے زار ونزار ہے؛ اس کے نتیجے میں اکثروں نے تو حالات سے سمجھوتہ کرنے میں عافیت سمجھی ہے، مگر ابھی ایمان کی رمق باقی ہے معاشرے میں اور اس بجھتی ہوئی شمع کی روشنی بڑھانے میں اور کہیں کہیں اس کو دو آتشہ بھی بنانے میں تبلیغ نے سب سے نمایاں کردار ادا کیا ہے؛ ہندوستان کے ایک دور افتادہ دیہات سے اٹھنے والی ایک صدا جو مخلص کے دل سے نکلی تھی وہ بارگاہِ الٰہی میں ایسی باریاب ہوئی کہ آج پون صدی گذرنے کے بعد بھی اس میں جادو بھری تاثیر ہے اور سخت سے سخت دل کو بھی موم کر دیتی ہے، گئے گذرے انسانوں کو بھی راہِ حق کا متلاشی بنا دیتی ہے،

اور صحیح شعورِ حیات بخش دیتی ہے، اور زندگیوں میں ایسا انقلاب برپا کردیتی ہے جو واقعی قابل رشک ہے، ایمان کی حفاظت کی فکر، سنت کی اتباع کا جذبہ، اعمال کی محنت، ذکر کا شوق، علماء کی قدر، یہ سب چیزیں اس دعوت کا بنیادی خاصہ ہیں، اور چوں کہ اس دعوت میں ٹکراؤ کے راستے سے گریز کی تعلیم دی جاتی ہے اور سلبیات سے اجتناب کرکے ایجابیات پر زور دیا جاتا ہے اور یہی انبیائے کرام کی دعوت کا امتیاز بھی ہے اس لیے بادِ مخالف کی تندی میں بھی پرسکون فضاؤں میں اس کا سفر جاری رہتا ہے بلکہ کامیابی کی منزلیں طے کرتا ہے اور ایسے خوش گوار نتائج برآمد کرتا ہے جو کسی اور تحریک اور دعوت سے متوقع طور پر سامنے نہیں آتے؛ یہ بالکل ایک عام مشاہدہ ہے؛ اور اس کا انکار ایک امر مشاہد کا انکار ہے جو ایک دیانت دار اور انصاف پسند شخص کبھی نہیں کرسکتا؛ تبلیغ سے کتنوں کی زندگیوں میں انقلاب آیا، کتنوں نے دینی اعتبار سے قابل رشک زندگیاں گذاریں، اعمال میں جان پیدا ہوئی، باطن نورِ ایمان سے مزین ہوا، اس کا مشاہدہ ہمیں اپنے اس سفر میں بھی ہوا۔ اور اس کا اقرار چین کے ان علماء نے بھی کیا جو عملی طور پر اس محنت سے وابستہ نہیں ہیں، اور خود جو علماء اس محنت سے وابستہ ہیں اور اب چین کے ذمہ داروں میں جن کا شمار ہے ان کا کہنا ہے کہ ہم جب تک اس جد وجہد سے جڑے نہیں تھے اس وقت تک ہم ازہر اور مدینہ سے فارغ ہونے کے باوجود بھی دعوت کا مزاج نہیں رکھتے تھے بلکہ ہمیں اپنے مقصد زندگی تک کا پتہ نہیں تھا؛ بس جیتے تھے کھانے کمانے کے لیے؛ اور کھاتے کماتے تھے بس جینے کے لیے؛ پھر جب اس کام کو اپنا کام سمجھ کر اس میں شریک ہوئے تو زندگی کا قرینہ آیا اور دعوت کا سلیقہ۔

انھیں لوگوں میں لانزو سے آگے کے سفر میں ہمارے رہبر، نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو، چیتے جیسی پھرتی کے حامل، دیکھنے میں دبلے پتلے مگر دریاؤں کا دل جس سے دہل جائے دل میں عزائم کا وہ طوفان رکھنے والے اور بلا کی حکمت کے ساتھ دعوت کے لیے سازگار ماحول کی قدر کرکے سنگلاخ زمینوں میں گلابوں کی روش اگانے والے شیخ داؤد صالح بھی ہیں۔

شیخ داؤد جامع ازہر سے فارغ ہیں، ابتداءً چین ہی میں مسجد کی تعلیم پائی جیسا کہ چینی

مسلمانوں کا دستور ہے، اور مسجد کی یہ تعلیمی تحریک کوئی چار سو سال سے چین میں جاری ہے؛ جس کی ابتدا شی آن سے ہوئی تھی، یہ ان مسلمانوں کی فکر کا نتیجہ ہے جنھیں بدلتے حالات میں چینی مسلمانوں کی دینی صورت حال کے متعلق تشویش ہوئی؛ ان غیور مسلمانوں نے مساجد میں تعلیمی تحریک شروع کی اور اس طرح دینی علوم کے لیے مساجد کو قلعہ بنادیا؛ آج بھی مساجد میں مسلمانوں کو تعلیم کی اجازت ہے، ورنہ مسجدوں سے باہر کی دنیا میں انھیں تعلیمی ادارے قائم کرنے کی آزادی اب بھی نہیں ہے، جو ادارے چل رہے ہیں ان سب کی سرپرستی حکومت کرتی ہے؛ اسی لیے کبھی کبھی مصالحت کی راہ پر ان لوگوں کو چلنا پڑتا ہے ورنہ انھیں ہر آزادی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

جامع ازہر سے فراغت کے بعد مصر ہی میں چار سال تک شیخ داؤد تجارت کے پیشے سے منسلک رہے، پھر چین منتقل ہوئے؛ اور اب ماشاءاللہ ایک بڑے تاجر بھی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ بلکہ سب سے بڑھ کر ان کی پہچان ایک داعی کی ہے؛ جسے وہ بحسن وخوبی نبھا بھی رہے ہیں، شیننگ میں تبلیغ کے ذمے دار ہیں۔

ان کے ساتھ اس وقت ان کے صاحب زادے حافظ نقی بھی تھے، یہ ابھی نوخیز ہیں، لنشیا میں حفظ قرآن کی تکمیل کے بعد اب اگلی تعلیم کے لیے ہندوستان آکر ندوے میں داخلہ لینے کے خواہش مند ہیں۔

یہ تینوں حضرات بڑے خلوص سے ملے، شیخ داؤد دو سو کلومیٹر کا سفر کرکے اپنی کار کے ساتھ ہمارا ساتھ دینے کے لیے آئے تھے، ہوائی اڈے سے لانزو تک کا وقت گھنٹہ بھر گفتگو اور احوال وکوائف کو جاننے میں گذرا، شیخ داؤد سے اسی دوران بے تکلفی بھی ہوگئی، انھوں نے ہی ہمارا اگلا پورا پروگرام مرتب کیا، بلکہ کارآمد بھی بنادیا۔

لانزو میں احباب نے ہمارے قیام کے لیے ایک ہوٹل کا انتخاب کیا تھا، جو ایک تبلیغی ساتھی ہی کا تھا اور اس میں ایک کمرہ جماعتوں ہی کے لیے مخصوص تھا؛ ہوٹل ہر طرح کی سہولتوں سے آراستہ تھا؛ کسی پانچ ستارہ ہوٹل سے کم نہیں تھا، اور یہ احبابِ چین کا دستور ہے

کہ جماعتوں کے قیام کا انتظام ہوٹل میں کراتے ہیں؛ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا سبب حکومت کا وہ قانون ہے جس کے تحت کسی مہمان کو اپنے گھر میں صرف چوبیس گھنٹہ ٹھہرانے کی اجازت ہے، ورنہ صاحب مکان کے خلاف کارروائی کا امکان ہوتا ہے؛ اس لیے احتیاط کے تقاضے پر احباب عمل کرتے ہیں اور یہ دعوت کے وسیع تر مفاد کے لیے بھی مفید ہے۔

لانزو

لانزو وسط چین میں کچھ شمال کی طرف واقع ایک قدیم اور تاریخی شہر ہے، یہاں کی عمارتیں بھی قدامت کی گواہی دیتی ہیں، یہ صوبہ کانسو (Gansu) کا ایک اہم شہر ہے، پورے ضلع کی آبادی تقریباً ۲۳/ ملین ہے جس میں ۱۰٪ مسلمان ہیں جن کی نسلیں اوغوری اور خوئی ہیں، یوں پورے چین میں کل ۵۶/ نسلیں ہیں جن میں ۱۳/ مسلمان ہیں، لانزو کی شہرت کی ایک وجہ یہاں کا دریائے اصفر ہے، جس کے کنارے کئی تہذیبوں نے جنم لیا اور گردش لیل ونہار کے ساتھ ہی وہ تاریخ کا ایک حصہ بن گئیں، شاہانِ لانزو نے بھی اس کی تاریخ کو روشنی اور نیک نامی بخشی ہے، تاریخ میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

لانزو کا پہلا دن

۲۵/ ستمبر کا دن لانزو کے احباب کے مشورے میں گذرا، ہم لوگوں نے دن بھر ہوٹل میں آرام کیا، پڑھنے لکھنے میں وقت گذرا، مولانا فیصل صاحب کے لیے تو یہ کسی نعمت مترقبہ سے کم نہیں تھا؛ انھوں نے اس فارغ وقت سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اب تک کی رودادِ سفر لکھ ڈالی؛ ہم لوگوں نے اشاروں میں کچھ لکھا کہ جب مزاج میں بشاشت ہوگی اور قلم میں روانی تب لکھ دیا جائے گا؛ اس لیے کہ طبیعت ہی ایسی پائی ہے کہ ہر وقت مائل گفتار نہیں ہوتی؛ اس کے لیے جب مناسب ماحول ملتا ہے، فضا خوش گوار ہوتی ہے، اور بادِ نسیم مشک بار تب طبیعت میں روانی پیدا ہوتی ہے، ذہن میں خیالات کا عکس پڑتا ہے، اور الفاظ معانی کا ساتھ دیتے ہیں، ورنہ گھنٹوں بیٹھنے کے بعد بھی ایک صفحہ مشکل سے لکھا جاتا ہے؛ اور پھر آج کا یہ وقت بھی ایسا تھا

کہ پہلے سے کوئی اطلاع نہ تھی کہ ہوٹل ہی میں پورا دن گذر جائے گا؛ مگر مولانا فیصل صاحب کے لیے تو ہر وقت وقتِ وصال اور ہر دم ان کا قلم سیال ہے؛ اس لیے انھیں کوئی اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا اور وہ مکمل اس کو کارآمد بنا دیتے ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ سفر اختتام کو پہنچتے پہنچتے مولانا کے سفرنامہ نے بھی رفاقت کا حق ادا کیا اور رودادِ سفر ختم ہونے کو آئی۔

کچھ احباب دوپہر میں ملنے کو آئے، ان میں حسین صاحب، یوسف صاحب اور عیسیٰ بھائی قابل ذکر ہیں، یہ سب دعوت کے پرانے ساتھی ہیں (یہاں پرانے ساتھیوں کے لیے قدماء کی اصطلاح بولی جاتی ہے؛ عجیب اور دلچسپ بات تو یہ کہ ہم لوگوں کا بھی اسی حیثیت سے ہر جگہ تعارف کیا گیا)، یوسف صاحب نے تو رائے ونڈ میں کچھ سال رہ کر تعلیم حاصل کی ہے؛ اس لیے کچھ اردو کی شد بد بھی رکھتے ہیں، عیسیٰ کی ملاقات نے تو دل پر گہرا اثر چھوڑا، یہ نو مسلم ہیں، جنوبی چین میں یُوتان کے رہنے والے ہیں، اسلام قبول کیے تین سال ہو چکے ہیں، طبیعت میں خوش مزاجی اور مہمان نوازی کوٹ کوٹ کر بھری ہے، خاص انداز میں ان کا سر کو ہلا کر ہاتھوں کو اٹھا اٹھا کر بات کرنا، دعا کی درخواست کرنا اور کچھ انگریزی، کچھ عربی اور کچھ اردو سب کے الفاظ کو ملا جلا کر اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے میں کامیاب ہونا؛ یہ سب دل پر گہرا نقش چھوڑ گیا۔

معلوم ہوا کہ یہاں نو مسلموں کی خاصی تعداد آباد ہے، کچھ لوگوں نے بتایا کہ ابھی حال ہی میں ۸۰/ غیر مسلموں نے اسلام کے دامن میں پناہ لی ہے جن میں گوانزو ہی سے تعلق رکھنے والے ۶۰/ کے قریب ہیں۔

نماز مغرب سے کچھ دیر قبل لوگ ہمیں لینے آئے اور ہم ان کے ساتھ چل پڑے، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ مغرب کی نماز حسین صاحب کے مکان پر پڑھنی ہے، وہیں کچھ لوگ جمع ہیں، کچھ دیر گفتگو ہوگی، اور شام کا کھانا بھی وہیں ہوگا۔

تھوڑی ہی دیر میں آسمان سے باتیں کرتی ایک طویل عمارت کے سامنے تھے، اترنے کا اشارہ ہوا، اور عین مغرب کے وقت ہم حسین صاحب کے مکان پر پہنچ گئے، یہ مکان غالباً

تیئیسویں یا ستائیسویں منزل پر تھا۔

مغرب کی نماز مولانا فیصل صاحب نے پڑھائی، بلکہ سفر میں اکثر مولانا ہی کی امامت میں نمازیں ادا ہوئیں، نماز میں بڑا لطف آیا، اس لیے کہ سامنے دریائے اخضر رواں تھا، اور ہم لوگ خوش گوار ہوا میں سانس لے رہے تھے، ستائیسویں منزل نے پھر لطف بھی دوبالا کر دیا تھا؛ مولانا کی قراءت نے ایسے میں سماں باندھ دیا۔

خطرناک دعوت یا مہمان نوازی کی انتہا

نماز کے بعد دستر خوان بچھا، پھل سجے، جن میں کچھ تو مانوس تھے اور کچھ سے آج ہی واسطہ پڑ رہا تھا، جیسے ڈریگون فروٹ (Dragon Fruit) وغیرہ، پھر جو مانوس بھی تھے آج ان کا مزہ دوسرا ہی تھا، ان میں انگور، سیب اور بیر خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، انگور اور بیر تو تقریباً چین کی ہر مہمانی کا حصہ رہے، خوب پھل کھائے، اجنبی اب تک یہی خیال کیے پھل کھائے جا رہے تھے کہ جو کچھ ہے پھل ہی ہیں؛ اب کوئی اور چیز تو آنی نہیں ہے، ہمارے یہاں ہندوستان میں پھل تو کھانے کے بعد ہی لائے جاتے ہیں اس لیے چین کو بھی ہندوستان سمجھ بیٹھے اور یہی خیال رہا کہ کھانا کہیں اور ہوگا یہاں تو بس ناشتہ ہے، مگر اس وقت ہمارے تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہی جب پھلوں کے بعد یکے بعد دیگرے نئے سرے سے دستر خوان سجتا چلا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سبزی (وہ بھی سمندری)، ترکاری، پنیر، مشروم (اپنی کئی قسموں کے ساتھ)، مچھلی، گوشت (بکرا، مرغ دونوں)، سوپ، اور ان سب کے ساتھ ہری چائے کے بڑے سے فنجان نمودار ہوتے چلے گئے، وہ بھی شکر کے بغیر، مگر شکر ہے کہ ساتھ میں ایک ٹرے میں مصری بھی تھی، ہری چائے (Green Tea) یہاں کے ہر کھانے کا جز ہے، یہ ایک قسم کی نباتاتی چائے ہے جس میں مختلف پودوں کا برادہ ڈالا جاتا ہے جو صحت کے لیے بالخصوص نظامِ ہضم کے لیے بے انتہا مفید ہے، جب تک ہم لوگ چین میں رہے اس چائے نے خوب ہمارے پیٹ کو سنبھالے رکھا، ورنہ اتفاق سے ہم تینوں نے معدہ بڑا کمزور پایا ہے اور چینیوں کو دیکھ کر تو ہمارا معدہ واقعی بے انتہا کمزور ہے، چین والوں کی محنت بھی زیادہ ہے اور خوراک بھی

ماشاءاللہ، ہم لوگوں کے بس کی بات نہیں کہ ان کی نقل کریں۔ چائے بھی اس انداز میں پی جاتی ہے کہ پیالی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی، ذرا سی جگہ خالی نظر آئی تو فوراً میز بان کا ہاتھ بڑھا اور پیالی کو بھر کر ہی اپنی جگہ لوٹا؛ اور جب تک خورد کا سلسلہ چلتا رہا نوش کا بھی یہ سلسلہ چلتا رہا، اس کے علاوہ الگ سے پانی پینے کا رواج ہم نے چین میں نہیں دیکھا۔

پھر ان متنوع کھانوں کو سجانے کا انداز بھی نرالا ہے، ہم لوگوں کے یہاں بیک وقت ساری چیزیں رکھی جاتی ہیں، مگر چین میں تو ایک ایک کر کے کھانے کے انواع لائے جاتے ہیں، پہلے ایک نوع سے سیری ہوگی پھر دوسری، پھر تیسری، پھر چوتھی، یہاں تک کہ کبھی کبھار یہ تعداد بڑھتے بڑھتے بلا مبالغہ پندرہ اور بیس تک پہنچ جاتی، آخر کار ہم لوگوں کو لفظ اکرام سے ایک قسم کا ڈر محسوس ہونے لگا اور ہم نے صاف صاف اپنے میز بانوں کو روکنا شروع کر دیا کہ آپ لوگ اتنا اہتمام نہ کریں، پھر بھی پانچ سات قسمیں تو کہیں نہ گئیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ چیز چین کی تہذیب کا ایک بنیادی جز ہے، مہمان نوازی کی یہ ریت ان کے یہاں رائج ہے، ورنہ انھیں برا محسوس ہوتا ہے، آخر اس قدر تنوع ان کے یہاں پتہ نہیں کہاں سے آیا؟ ہوسکتا ہے کہ ترکمانستان سے ہوتی ہوئی ایرانی تہذیب کے اثرات ان میں داخل ہوگئے ہوں، حالاں کہ ایک طرف مہمان نوازی بہت اچھی بات ہے اور اس سلسلے میں اہل چین واقعی مبارک باد کے مستحق ہیں، مگر ہمارے خیال سے کھانے پینے میں اس قدر تنوع شاید بات کو اسراف تک پہنچا دیتا ہے۔

یہاں کھانے کے بعد مولانا فیصل صاحب نے تھوڑی دیر دین کی اہمیت پر گفتگو کی، جس کا ترجمہ مولوی عادل نے چینی زبان میں کیا، پردہ نشین خواتین نے بھی غور سے سنا۔ اس کے بعد یوسف صاحب کے مکان پر پرانے ساتھی کچھ جمع ہوئے تھے اس لیے وہیں چل پڑے، عشاء کی نماز یوسف صاحب کے بھائی ایوب صاحب نے پڑھائی۔

جملہ معترضہ کے طور پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ یہاں انبیاء کے ناموں کا بڑا رواج ہے، چینی مسلمانوں کی یہ خصوصیت بڑی قابل تقلید ہے، اگر چہ کہ سرکاری کاغذات کے لیے ان

کے الگ نام ہوتے ہیں مگر اپنے درمیان اور بالخصوص مذہبی حلقوں میں تعارف کے لیے ان
حضرات نے اپنے اسلامی نام بھی رکھے ہیں جن میں ہمارا اندازہ تو یہ ہے کہ نوے فیصد نام
انبیائے کرام کے ہیں، احمد، داؤد، ایوب، صالح، یوسف، ابراہیم، اسماعیل، اسحاق،
یعقوب، یونس کثرت سے یہ نام رائج ہیں، یہاں تک کہ حضرت ہود اور حضرت لوط تک کا
نام انھوں نے زندہ رکھا ہے اور اس طرح ان سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے، خدا ان کی اس
ادا کو قبول فرمائے اور انبیاء کی یہ محبت ان کے کام آئے۔

یہاں بڑی تعداد میں ساتھی حاضر ہوئے تھے، تقریباً پچاس یا اس سے کچھ اوپر ہی
تھے، مولانا فیصل صاحب ہی نے یہاں بھی گفتگو کی، اور دین کے سلسلے میں دی جانے والی
قربانیوں کو اجاگر کیا، اور اس کی اہمیت پر زور دیا، اس کے بعد ناشتے کا انتظام تھا جس میں
کچے اخروٹ ہماری خصوصی دلچسپی کا باعث تھے۔

احبابِ لانزو کی کچھ صفات

لانزو کے ساتھیوں میں ہم نے بڑی تواضع محسوس کی، نیز ان کا جذبِ اندروں بھی
خوب تھا، دعوت وتبلیغ سے محبت بھی مثالی تھی، اسی طرح ہم نے چین میں اکثر یہ بات بھی
محسوس کی کہ انھیں ہندوستان سے بے حد لگاؤ ہے، ہندوستان میں ہونے والی دینی کوششوں
کو وہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور اپنے فرزندوں کو تعلیمِ دین کے لیے ہندوستان
بھیجنے کے آرزومند ہیں، بلا مبالغہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان دنوں کم از کم دو سو سے زائد طلبہ کو
ہندوستان بھیجنے کی پیش کش ہوئی۔ انھیں یہ چیز بھی معمولی ہونے کے باوجود بہت متاثر کرتی
تھی کہ ہندوستان سے دین کی نسبت پر کچھ لوگ آئے ہیں، کئی موقعوں پر تو ہم لوگوں کو
شرمندگی بھی ہوتی کہ ہم لوگ کیسے، ہماری زبان کیسی، ہمیں اپنے حال کی خوب خبر، اپنی
حقیقت خوب معلوم، مگر صرف دین کی اس نسبت پر ہماری بڑی قدر ہوتی، بڑا اکرام ہوتا،
اور ہماری بات خوب توجہ سے سنی جاتی، بلکہ کبھی کبھی تو ان کا جذبِ اندروں اشکوں کی
صورت میں بھی ڈھل جاتا، تھوڑی دیر دین کی بات وہ بھی سادہ اور سرسری انداز میں مگر ان

پر اس قدر تاثر ہوتا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے؛ اس سے ایک طرف چینی
مسلمانوں کے دین سے تعلق نیز ذرا سی نمی پر اس خاک کی زرخیزی کا بھی اندازہ ہوتا ہے،
اسی طرح دین کی باتوں کا اعجاز اور فطرت سلیم پر اس کی اثر انگیزی بھی سامنے آتی ہے۔

۲۶/ستمبر

جمعہ کا دن تھا، ناشتہ احمد حسن صاحب کے مکان پر تھا، یہاں بھی بڑا پر تکلف ناشتہ ہوا،
جس میں دس سے زائد انواع سجائے گئے تھے، ہم لوگوں نے حسب خواہش تناول کیا، پھر
اصحابِ خانہ کی فرمائش پر ڈاکٹر عبدالحمید اطہر نے وقت کے انضباط پر مختصر اور جامع گفتگو کی،
جسے حاضرین نے بے حد پسند کیا، یوں بھی وہ اس موضوع پر کافی تجربہ رکھتے ہیں، علمی طور پر
بھی اور زندگی میں عمل کے ذریعے بھی؛ اس لیے ان کی بات کیوں مؤثر نہ ہوتی۔

اب یہاں سے سیدھے جامع مسجد، شیقوان پہنچے، یہ یہاں کی وسیع وعریض جامع
مسجد ہے۔ ابھی جمعہ میں کافی وقت تھا، اذان سے گھنٹہ بھر پہلے ہی ہم لوگ پہنچ چکے تھے،
ضروریات سے فارغ ہوئے، کچھ لوگوں سے ملاقات ہوئی، ان میں چینی بھی تھے کچھ
دوسرے ملکوں کے بھی تھے، جن میں ہمارے پڑوسی ملک کے بھی لوگ تھے، (ان لوگوں نے
نماز کے بعد کھانے کی دعوت دی مگر نماز کے بعد حسب وعدہ ہم لوگ مقررہ جگہ پہنچے تو
داعیوں سے ملاقات نہ ہو سکی)، مسجد کا صحن کافی وسیع تھا، معلوم ہوا کہ مسجد اور اس کے صحن
میں عید کی نماز میں ہزاروں افراد سما جاتے ہیں، ویسے آج جمعہ کے روز بھی تعداد ہزاروں
سے کچھ کم تو نہ تھی، لوگوں کے اژدحام کو دیکھ کر ہم تو سمجھ رہے تھے کہ نماز کا وقت ہو چکا ہے،
مگر ہماری حیرت کی اس وقت کوئی انتہا نہ رہی جب ہم مسجد میں پہنچے تو مسجد کھچا کھچ بھری
ہوئی تھی، تل دھرنے کو جگہ نہ تھی، کسی طرح اوپر کی منزل تک ہماری رسائی ہوئی۔ یہی حال
ہم نے آگے کے سفر میں شینگ کی جامع مسجد کا بھی دیکھا اور وہ تو جمعہ کا دن بھی نہ تھا پھر بھی
نمازیوں کا وہ ہجوم تھا جو ہمارے یہاں عیدین میں نظر آتا ہے، شینگ کی جامع مسجد کے
بارے میں تو معلوم ہوا کہ اس کے اندر و باہر عیدین میں تین لاکھ افراد کا مجمع ہوتا ہے اور جمعہ

کی نماز میں پچاس ہزار افراد شرکت کرتے ہیں۔

بہر حال جامع مسجد شیقوان (Xiguan) میں ہم نے جمعہ کی نماز پڑھی، اس مسجد کا نظم سرکار کی سرپرستی میں چل رہا ہے، صرف یہی مسجد نہیں بلکہ چین کی اکثر مسجدوں کا نظم حکومت کی ماتحتی میں چلتا ہے، اس لیے رہبروں نے منتشر ہو کر نماز پڑھنے کا مشورہ دیا تاکہ اجنبی ایک ساتھ سب کی نگاہ میں نہ آسکیں۔

خطبہ چینی زبان ہی میں ہوا، کافی دیر تک چلتا رہا، (ہم لوگوں کو ندوے کے خطبے کی یاد آ گئی)، ایک عجیب بات یہاں کی اکثر مسجدوں میں یہ دیکھی کہ جنازے کی نماز جمعہ سے قبل پڑھی جاتی ہے، پتہ نہیں اس میں کیا حکمت ہوتی ہے، چناں چہ یہاں بھی جنازے کی نماز پڑھی گئی اور یہ بات بھی ہمارے استعجاب میں اضافے کا سبب بن رہی تھی کہ کہیں جنازہ سامنے نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔

نماز میں امام صاحب کی قراءت نے کافی متاثر کیا، چین میں ایسا خوب صورت لب ولہجہ ہم نے کہیں اور نہ پایا۔

نماز کے بعد لوگوں نے ہم سے ملاقاتیں کیں، ان میں ایک بڑے میاں کی محبت بھری ملاقات نے دل پر گہرا اثر چھوڑا، بڑھ کر اس انداز میں معانقہ کیا کہ دل جذبات پر قابو نہ پا سکا، اور مجھ جیسا سخت دل بھی موم کی طرح پگھل گیا اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، ان بزرگ سے بعد میں شیننگ میں بھی ملاقات ہوئی اور وہاں بھی بڑے تپاک سے ملے، دین سے محبت کے سوا اس کی اور کیا توجیہہ کی جا سکتی ہے! اللہ تعالیٰ ان کی اس محبت کو قبول فرمائے اور حشر کی رسوائیوں اور روسیاہیوں سے ہم سب کو بچا کر اپنے عرش کا سایہ نصیب فرمائے، آمین۔

نماز جمعہ کے بعد تبلیغی مرکز میں جانا ہوا جسے یہاں کی اصطلاح میں ''استقبال'' کہا جاتا ہے، جگہ جگہ دعوت والوں نے اس طرح کچھ جگہوں کو استقبال کے نام سے مخصوص کر رکھا ہے جہاں جماعتیں آتی ہیں اور ٹھہرتی ہیں، اور وہیں اعمال زندہ ہوتے ہیں۔ یہاں ہم لوگ تھوڑی دیر بیٹھے، اور اسی کے متصل جو مسجد جبل احمر ہے، اس کے امام صاحب مولوی

لوط سے بھی ملاقات ہوئی، جو وہاں مرکز استقبال میں بڑی عمر کے لوگوں کو قرآن بھی پڑھاتے ہیں، مسجد میں تھوڑی دیر کے لیے ساتھی جمع ہوئے، اب کی بار ہماری باری تھی، اس لیے ہم نے دین کی قدر و منزلت اور اس کے لیے قربانی کی اہمیت پر تھوڑی دیر گفتگو کی، ترجمہ مولوی عادل ہی نے کیا، مولوی عادل کی مادری زبان تو تبّتی ہے مگر انھوں نے ادھر ایک سال کے عرصے میں خاصی چینی سیکھ لی ہے۔ چوں کہ عمر رسیدہ حضرات یہاں بڑی تعداد میں موجود تھے اس لیے مولانا فیصل صاحب نے حضرت سید احمد شہیدؒ کے ان خلفاء سے متعلق کچھ معلومات جاننی چاہیں جنھیں سید صاحبؒ نے چین کے کسی علاقے میں دعوت کے کام سے بھیجا تھا اور پھر تاریخ نے ان کی کچھ بھی تفصیلات یاد نہ رکھیں؛ ان حضرات کے اخلاص کے سوا اس کی کیا توجیہہ کی جا سکتی ہے۔ ان حضرات کی سید صاحبؒ کی خدمت میں حاضری اور سید صاحبؒ کے ساتھ جہاد میں شرکت کی تمنا اور سید صاحبؒ کے انھیں واپس بھیجنے اور دعوت و اصلاح کے کام پر مامور کرنے کا ذکر وقائع احمدی میں موجود ہے۔

اس مسجد کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہاں پہلے کوڑے کا ڈھیر تھا، جسے امام صاحب نے خرید کر صاف کیا اور پھر ایمان کی پاکیزگی کا گھر بنایا؛ مسجد اور مرکز کی تعمیر وجود میں آئی۔

یہاں سننے میں آیا کہ قریب ہی ایک بڑے عمر رسیدہ بزرگ ہیں جن کی عمر ۸۸/ سال ہے، ان سے ملاقات کا پروگرام بنا، مگر اس وقت کامیابی نہ ملی، اتنے میں یحییٰ صاحب جو ایک ہوٹل کے مالک ہیں نے اکرام کی پیش کش کی جسے ہمارے رہبروں نے اس لیے قبول کیا کہ یہاں ایک خاص چیز بنتی ہے جو پوری دنیا میں مشہور ہے۔ ہوٹل میں کئی قسم کے کھانے ہمارے سامنے رکھے گئے جن میں لامیان (نوڈلز) خصوصی اہمیت کے حامل تھے، معلوم ہوا کہ یہاں بننے والے لامیان نوڈلز اور اس کو پکانے کا طریقہ بھی پوری دنیا میں مشہور ہے۔

یہاں سے ایک مسجد میں جانا ہوا، عصر کی نماز کا وقت قریب تھا اور شیخ سے ملاقات کی امید تھی، مگر مسجد کے استنجا خانوں میں طہارت کے لیے پہنچے تو سخت کوفت ہوئی اور طبیعت جھنجھلا اٹھی، عدم صفائی اور پاکی سے لاپرواہی یہاں کے اکثر استنجا خانوں میں صاف نظر آتی

ہے، نہ صرف یہاں بلکہ چین کے کئی شہروں میں اس پر توجہ بہت کم ہی محسوس ہوئی اور اکثر ہم لوگوں کو کوفت ہوتی رہی۔

نمازِ عصر ہوئی، پھر کچھ کتابیں دکھائی دیں، ذوقِ جستجو نے ان کے دیدار پر ابھارا، سب سے پہلے شیخ داؤد نے ایک کتاب دکھائی معرفة الاسلام من النبي محمد، یہ کتاب اسلام کے تعارف پر مشتمل ہے جو شیخ محمد صالح ٹھنکلی (Chenkeli) کی تصنیف ہے جنھیں ۱۹۷۰ء میں حنان کی حکومت نے قتل کیا اس لیے کہ اسلام کی سربلندی کے لیے کافی سرگرم تھے اور حکومت کو ان سے خطرہ محسوس ہوا تو انھیں راستے ہی سے ہٹا دیا۔ یہ کتاب بڑی مقبول ہوئی، انھوں نے التاج لجامع الأصول کا بھی چینی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

اس موقع پر ہم نے قرآن کے ترجموں کے بارے میں معلوم کیا تو پتہ چلا کہ کئی ترجمے ہو چکے ہیں جن میں محمد ماچین اور وان جِنگ زھئی (Wanjingzhai) کے ترجمے بڑے مشہور ہیں، یہ سن کر بڑا تعجب ہوا کہ کسی نے اب تک پوری تفسیر نہیں لکھی سوائے ایک کے جو تفسیر بالرائے کے زمرے میں آتی ہے اور یہ ایک ایسے شخص کی جرأت ہے جس کے عقیدے میں فتور تھا، غالباً ختم نبوت پر اس کا ایمان نہیں تھا۔

ادھر قریب میں دینی بیداری کے نتیجے میں چینی زبان میں دینی کتابیں کافی چھپ کر سامنے آئی ہیں اور ترجمے بھی خوب ہوئے ہیں؛ جن میں ریاض الصالحین کا ترجمہ ننگشا کے شیخ محمد انس نے، مشکوٰۃ المصابیح کا ترجمہ شیخ عثمان بن محمد نے اور الأحاديث المنتخبة (في الصفات الست) کا ترجمہ شینگ کے شیخ شعیب نے، حیاۃ الصحابۃ کا ترجمہ لنشیا کے شیخ احمد بہاؤالدین نے اور تفسیر ابن کثیر کا ترجمہ شینگ کے شیخ ایوب نے کیا ہے، یہاں پر احیاء علوم الدین کا ترجمہ بھی دیکھا۔

دریائے اصفر (ہونگ ہو)

عصر بعد وہاں سے واپس ہوتے ہوئے دریائے اصفر کا نظارہ کیا، یہ چین کا اہم دریا ہے جسے یہاں پر بالکل وہی حیثیت حاصل ہے جو مصر میں نیل کو، یہ تبت سے بہتا ہوا مشرقی

چین کے تنگھائی تک جاتا ہے، مشہور مؤرخ مولانا غلام رسول مہر نے اپنی تاریخ اسلام میں چینی تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے اس دریا کی چین کے لیے اہمیت اور اس کی قدامت پر روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتے ہیں:-

''چین کی تہذیب بھی بہت پرانی مانی جاتی ہے، اس کا آغاز چین کے مشہور دریا ہونگ ہو (دریائے زرد) کے کناروں پر ہوا، اس سلسلے میں بہت سے افسانے بیان کیے جاتے ہیں، مثلاً پونے تین ہزار برس قبل مسیح ایک بادشاہ تھا جس نے لکھنے کا فن ایجاد کیا، کیلنڈر بنایا، گانا سکھایا، چھ جانور پالے یعنی گھوڑا، اُلّو، بٹیر، مرغ، کتّا، سور۔ اس کے جانشین نے پانچ غلوں کی کاشت سکھائی یعنی چاول، دو قسم کی جوار، گیہوں اور سویا۔ بادشاہ کے کئی خاندان یکے بعد دیگرے حکمراں رہے، ابتدا میں بادشاہوں کے لیے سب سے بڑا کام یہ تھا کہ لوگوں کو دریا کی خوف ناک طغیانیوں سے بچانے کا انتظام کریں، دریائے ہونگ ہو چین کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو نیل کو مصر کے تعلق سے حاصل ہے، یعنی ساری آبادی اور کاشت کاری اس کے پانی پر موقوف ہے، لیکن جب اس میں طغیانی آجاتی ہے تو یہ انتہائی مصیبتوں کا باعث بن جاتا ہے، بادشاہوں کو عام لوگ خدا کا سایہ سمجھتے تھے، ان کے ماتحت امیروں نے زمین کے وسیع خطے سنبھال لیے تھے اور جاگیروں کا ویسا ہی نظام جاری ہو گیا تھا جیسا ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ کے اندر جاری تھا، یہ امیر موروثی تھے یعنی باپ کے بعد بیٹا امارت سنبھال لیتا۔''

اس موقع پر مولانا نے قدیم چین کی صنعت اور حرفت سے متعلق بھی خوب لکھا ہے، جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، لکھتے ہیں:-

''چینیوں نے صنعت کو کمال پر پہنچا دیا تھا، کاغذ اور چھاپہ سب سے پہلے انھیں نے ایجاد کیا، چینی کے برتن انھیں نے بنائے، ریشم انھیں نے پیدا کیا، چائے کا استعمال بھی پہلے پہل چین ہی میں ہوا، چین سے چائے دوسرے ملکوں میں پہنچی۔ بارود کی ایجاد کا سہرا بھی انھیں کے سر ہے۔'' (مختصر تاریخ اسلام از مولانا غلام رسول مہر/صفحہ ۳۳-۳۴)

شیخ احمد بن ابراہیم سے ملاقات

مغرب کی نماز ہمیں مسجد لی چاون میں پڑھنی تھی، جہاں شیخ احمد سے ملاقات کا وقت مقرر تھا، اس لیے سیدھے ہم لوگ انھیں کی مسجد پہنچ گئے۔ شیخ احمد کی عمر اس وقت ۸۷/ سال ہے، یہاں کے سب سے عمر رسیدہ بزرگ اور استاذ الاساتذہ ہیں (خود ہمارے رہبر شیخ داؤد کے بھی استاذ ہیں)، مجاہد کبیر شیخ سعد الدین قوینی ان کے ہم زلف تھے، شیخ سعد الدین قوینی کا نام چین کی تاریخ عزیمت واستقامت کا ایک تابناک اور زریں عنوان ہے، اس غربت کدے میں احیائے اسلام کی کوششوں میں ان کی قربانیوں اور جاں فشانیوں کا بڑا حصہ ہے، ضرورت ہے کہ ان کی خدمات کو وابستگانِ علم وتحقیق دنیا کے سامنے لائیں تاکہ دنیا کے بت کدوں میں توحید کی صدا لگانے والوں کے سامنے مشعل راہ ہو سکے۔

ان سے کافی دیر ملاقات رہی، مغرب سے عشاء تک مجلس میں بیٹھے رہے، مولانا فیصل صاحب نے کئی سوالات یہاں کی دینی خدمات اور سرگرمیوں سے متعلق کیے، اور شیخ نے جوابات دیے، جس سے معلومات میں کافی اضافہ ہوا، تاریخ کی کچھ گم شدہ کڑیوں کا بھی سراغ لگانے کی کوشش کی مگر پوری طرح کامیابی نہ ملی، البتہ شیخ نے بہت ساری قیمتی باتیں بتائیں، اور بہت خوش دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ بیٹھے رہے، عمر کے اعتبار سے ایسے مرحلے میں عام طور پر انسان کے قویٰ جواب دے جاتے ہیں مگر شیخ کے اوپر اضمحلال اور نقاہت کے آثار دور دور سے بھی نہیں تھے۔

انھیں سے معلوم ہوا کہ مجاہد کبیر شیخ سعد الدین قوینی شیخ نوح کے حفید ہیں، ان کے ایک بھائی عبداللہ شینگ میں ہیں اور ایک بھائی یوسف تھے جن کے صاحب زادے مولوی یحییٰ یہیں لانزو میں مقیم ہیں۔ شیخ نوح اور ان کے خانوادے کی یہاں پر بڑی دینی خدمات رہی ہیں، شیخ نوح کی وفات کے وقت شیخ احمد ۳/۴ سال کے تھے۔

کسی زمانے میں یہاں سے ۱۰/ علماء ایک سال کے لیے مکہ میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے گئے تھے، ان علماء نے واپس آکر بڑی خدمات انجام دیں، انھیں میں ایک شیخ یونس بھی تھے جو

یہاں کی جامع مسجد کے امام رہے، اور ۸۶/ سال کی عمر میں پانچ سال قبل وفات پائی۔

یہاں مسجد لی چاون میں ایک مدرسہ بھی ہے، جس کے اساتذہ بھی اس وقت موجود تھے، جن میں مولوی ہارون نے مغرب وعشاء کی نماز پڑھائی، بڑے خوش الحان ہیں۔ اس کے علاوہ مولوی شمس الدین بھی ہیں۔

ایک اور بزرگ ۶۷/ سالہ شیخ اسماعیل سے بھی ملاقات ہوئی، جنھوں نے نور الدین نامی کسی عالم کے ساتھ مل کر ایک کتاب ''معلومات أساسیة عن الاسلام'' لکھی ہے، ریاض میں دو سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۲۰/ سال تک یہاں کے معہد اسلامی میں خدمات انجام دیں اور اب ریٹائر ہیں۔

نماز عشاء کے بعد شیخ احمد نے اپنے ساتھ کھانے پر اصرار کیا، ہم لوگوں کے انکار پر کم از کم اپنے کمرے میں بلایا، شدید اصرار پر ہم لوگ پہنچے تو انھوں نے مہمان نوازی کی انتہا کر دی، روزے سے تھے اور ہمارے اکرام میں بیچارے مغرب سے عشاء تک بیٹھے رہے، اور پھر عشاء کے بعد جو افطاری تھی وہ سب ہمارے سامنے رکھ دی، اور بہت اہتمام کے ساتھ ماحضر ہم لوگوں کو کھلانے پر تلے رہے۔

۲۷/ ستمبر

ایک دینی فکر رکھنے والے اور دعوت سے جڑے ہوئے ساتھی عبداللہ بھائی کے یہاں ناشتہ تھا، اس لیے ان کے مکان پر جانا ہوا جو پچیسویں منزل پر تھا، یہاں پچیس اور ستائیس منزل ایک معمولی سی بات ہے، عمارتیں کافی اونچی آسمان سے باتیں کرتی نظر آتی ہیں۔ یہاں کی ایک نمایاں چیز ہرا تربوز تھا جسے آج زندگی میں پہلی دفعہ کھانے کا اتفاق ہو رہا تھا، اب تک تو لال تربوز کھائے تھے مگر آج پہلی دفعہ ہرا تربوز نظر کے سامنے تھا۔

یہاں بھی کافی کتابیں الماری کی زینت تھیں، جن میں کتب ستہ کے تراجم، اور حیاۃ الصحابہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ یہیں وہ تفسیر بھی دیکھی جس کی طرف اشارہ ہم نے اوپر کہیں کیا ہے، جو تفسیر بالرائے کے زمرے میں داخل ہے، معلوم ہوا کہ اس کے مصنف

نے ڈرتے ہوئے اپنا نام بھی نہیں لکھا ہے بلکہ اپنی ماں کا نام لکھ دیا ہے، تفسیر خرافات اور باطل افکار کا چربہ ہے، معجزات کا بھی انکار کیا ہے، سن اشاعت ۱۴۲۶ھ-۲۰۰۵ء ہے۔

یہاں باتوں ہی باتوں میں ساتھیوں نے علماء کی ذہن سازی اور دعوت سے جڑنے کی ترغیب اور مضبوط تشکیل کی طرف ہمیں توجہ دلائی؛ جس کا ہم لوگوں نے اپنی آئندہ کی گفتگوؤں میں لحاظ رکھا۔

کافی دیر یہاں گفتگو رہی، پھر ہم لوگ کھانے کے لیے سترہویں منزل پر ابراہیم صاحب کے یہاں پہنچے اور چوں کہ ہمیں آج ہی لانزو سے نکل کر لنشیا پہنچنا تھا اس لیے جلد ہی کھانے سے فارغ ہوگئے۔

لانزو سے لِنشِیا (Linxia) کے لیے

طے شدہ پروگرام کے مطابق یہاں سے لِنشِیا (Linxia) کے لیے نکلنا تھا؛ نکلتے وقت لانزو کے متعلق اچھے جذبات اور دینی مستقبل کے تئیں بہتر امیدیں لے کر ہم لوگ نکلے، احباب نے یہاں کافی خیال رکھا، بہت اکرام کیا، اس قدر کہ ہمیں ''دیوارِ چین کے سائے میں'' کے مصنف ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی کی بات یاد آگئی؛ انھوں نے پچیس سال قبل یہاں کا سفر کیا تھا، اس وقت جس طرح کے اکرام کا معاملہ لوگوں نے کیا اس کے متعلق انھوں نے یہ جملہ لکھا ہے کہ لانزو کے باشندوں نے ہمیں شہزادہ بنا دیا؛ ہمارے دلوں کی بھی بعینہٖ وہی کیفیت تھی، لانزو کے احباب کا تعلق اور محبت کبھی بھلائے نہ بھلے گی۔

شیخ داؤد اور مولوی عادل کی معیت میں لنشیا کے لیے روانہ ہوئے، لانزو کی طرح یہ بھی صوبہ کانسو (Gansu) ہی کا ایک ضلع ہے، چین میں دو صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں: شِنْجِیانگ اور نِنگْشا، ان کے علاوہ صوبہ کانسو اور چنگھائی (Qinghai) میں بھی مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ لانزو سے لنشیا کی مسافت تقریباً سوا سو کلومیٹر کی ہے، راستے میں رم جھم بارش اور ہرے بھرے باغات اور کھیت کھلیانوں نے لطف میں اضافہ کر دیا، ہر طرف ہریالی تھی، اور ویسے تو پورے چین میں ہم نے ہر جگہ ہریالی ہی پائی،

کہیں خالی اور بے کار زمین ہمیں نظر نہ آئی، یا تو کھیت اور باغات یا پھر انڈسٹریز اور فیکٹریز۔ اکثر جگہوں پر یہ بھی نظر آیا کہ دور افتادہ دیہاتوں میں پوری منصوبہ بندی کے ساتھ مخصوص طرز کی کئی عمارتوں پر مشتمل ایک کالونی ہی بسادی گئی ہے۔

قدیم چینی فن کاری کا نمونہ مسجدیں بھی راستے میں نظر آئیں، ۶۰/کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جب شام ڈھل رہی تھی ہم لوگ ایک بستی کے احاطے میں داخل ہوئے، معلوم ہوا کہ اس بستی کا نام قوانغ خہ (Guanghe) ہے، یہاں ایک ادارہ ''معهد العلوم الشرعية لاعداد الدعاة والمعلّمين'' میں جانا تھا، ادارہ تقریباً ۲۲/سال قبل قائم کیا گیا جس کا مقصد اس کے نام سے ظاہر ہے، اس کے ناظم محمد سعید الدین صاحب سے ملاقات ہوئی، کافی خوش ہوئے، ہم لوگوں نے تعلیمی صورت حال سے متعلق سوالات کیے تو سہم سے گئے، معلوم ہوا کہ ڈاکٹر مصطفیٰ طحان صاحب سے بھی رابطہ ہے، ہر سال کویت جاتے ہیں، لائبریری کی اکثر کتابیں شیخ نادر نوری مرحوم کی طرف سے ہدیہ کی گئی ہیں، شیخ نادر نوری بھی عجیب صاحبِ خیر تھے؛ کہاں کہاں انھوں نے دینی بیداری کی کوششیں کیں اور کن کن صورتوں میں کیں، اللہ ہی بہتر جانتا ہے، ابھی قریب میں وفات پائی ہے؛ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور انھیں بہتر بدلہ عطا فرمائے۔

یہاں شیخ اسحاق بھی مدرس ہیں جن کے ہمارے شیخ داؤد سے اچھے تعلقات ہیں، انھوں نے مصر میں ایک سال اور پھر لیبیا میں رہ کر تعلیم حاصل کی ہے۔ یہیں ایک منگولین نوجوان محمد نوح سے ملاقات ہوئی جو مل کر کافی خوش ہوئے، ۲۰/سال قبل اس ادارے میں تین سال رہ کر فارغ ہوئے اور پھر مکہ میں اُم القریٰ میں انھوں نے دس سال گزارے، آج کل بیجنگ میں حلال مصنوعات تیار کرنے والی ایک کمپنی کے ڈائریکٹر ہیں۔ چین میں اس طرح کے اداروں سے فارغ کئی فضلاء بڑی بڑی کمپنیوں سے متعلق ہیں، یہ بھی وقت کی ایک اہم ضرورت ہے لیکن ساتھ ہی دعوتی مزاج اس سے پہلی بنیادی ضرورت ہے جس کی طرف مولانا فیصل صاحب نے یہاں کے ذمے داروں کو توجہ دلائی، نیز عربی زبان سیکھنے

سکھانے اور پڑھنے پڑھانے کا کیا مقصد ہونا چاہیے اس پر بھی مولانا نے روشنی ڈالی۔

اس شہر میں دعوتی مزاج رکھنے والے کم لوگ ہیں، تبلیغی محنت کی بھی مخالفت ہے، مسلمانوں کی آبادی تو اٹھانوے/ ۹۸ فیصد ہے، مگر بدعات کا زور ہے، اور بدعات کو بڑھاوا دینے میں یہاں پر قادریہ کی طرف منسوب سلسلے کو بڑا دخل ہے، اگر چہ کہ قادریہ ایک صحیح نسبت ہے مگر چین میں اس پر بدعات کا خوب گرد وغبار پڑ گیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تصوف کے دشمنوں کو تو خوب تصوف کے خلاف بولنے کا موقع ملتا ہے، ساتھ ہی ہمارے دعوتی حلقے بھی تصوف کے نام سے بدظن ہیں، حالاں کہ ہم لوگوں نے موقع بموقع لوگوں کا ذہن صاف کرنے کی کوشش کی کہ تصوف کے نام سے آپ لوگ نہ بدکیں، بلکہ تصوف تو بعد کی صدیوں کی ایک اصطلاح ہے، اصل تو اس کی روح احسان اور تزکیہ ہے جس کی ضرورت ہر زمانے اور ہر دور میں مسلّم ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہونا چاہیے، ہاں وقتاً فو قتاً اس پر بعض حلقوں میں جو گرد وغبار آجاتا ہے اس کو صاف کر کے اس کی اصل روح کو لینے کی کوشش کرنی چاہیے، اور یہ کام بھی ہمارے اہل اللہ نے ہر زمانے میں کیا ہے اور دین کو اس کی صحیح شکل میں باقی رکھنے کی کوشش کی ہے، یہ ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

قادری مسجد میں ہمارے رہبر ہم کو لے کر نہ گئے، اس میں حکمت بھی پوشیدہ تھی، ان حضرات کو ورنہ کام میں دشواری کا سامنا ہوتا، دعوت کا کام کرنے والوں کو اپنا ہر قدم پھونک کر رکھنا پڑتا ہے اور بڑی احتیاط کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے ورنہ ان کی ساری محنت پر پانی پڑنے کا خطرہ رہتا ہے۔ اور اس احتیاط میں ہمارے چینی رہبر کافی ممتاز ہیں، وہ بڑی حکمت کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔

قوانغ خہ (Guanghe) کی قادری مسجد کے بارے میں ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ یہاں سلام کے بعد دوسجدوں کا اضافہ کیا جاتا ہے، پتہ نہیں یہ کون سی بدعت ہے اور کس بنا پر اختیار کی گئی۔ ویسے تو بدعت کے لیے کوئی تُک بھی ہوتا کہاں ہے، وہ جب چاہے اور جیسے چاہے وجود میں آجاتی ہے۔

یہاں سڑکوں پر ایک عجیب وغریب چیز ایک پہیے پر چلنے والی کار تھی، جو ہمارے استعجاب میں اضافہ کر رہی تھی، اللہ نے چینیوں کو عجیب وغریب دماغ دیا ہے، وہ کچھ نہ کچھ سوچتے ہیں اور وقتاً فو قتاً کوئی نہ کوئی چیز ضرور تیار کرتے ہیں۔ کہیں گوڈس بائیک بھی نظر آئی اور اکثر تو سڑکوں پر دوڑنے کے لیے ان لوگوں نے بیٹری سے چلنے والی سواریاں تیار کر لی ہیں جن سے نہ صوتی آلودگی ہوتی ہے اور نہ فضائی، اور کم خرچ میں کام بھی ہو جاتا ہے۔

مغرب کے وقت یہاں سے فارغ ہو کر نکلے، اور مزید ۷۰/ کلو میٹر کا فاصلے طے کر کے عشاء کے وقت لنشیا پہنچے۔

لِنشِیا (Linxia)

لانزو سے جنوب مغرب میں دریائے Daxia کے کنارے واقع' یہ شہر لِنشِیا (Linxia) ایک خوب صورت اور تاریخی اعتبار سے بھی بے حد اہمیت کا حامل رہا ہے، یہ بھی صوبۂ کانسو کا ایک ضلع ہے، صوبۂ کانسو کی آبادی تقریباً تین کروڑ ہے، جس میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً پچاس سے پچپن فیصد ہے، لنشیا کو تاریخ میں Hezhou کے نام سے بھی جانا جاتا رہا ہے۔ یہاں کی اکثریت کی قومیت خوئی ہے۔ یہ چین کا ایک مشہور شہر ہے، یہاں کی خصوصیت اس کا اسلامی رنگ ہے، مسجدیں بڑی تعداد میں ہیں، مسجدوں کی کثرت کی وجہ سے اسے چھوٹا مکہ کہا جاتا ہے، لوگوں نے بتایا کہ لنشیا اور اس کے اطراف میں پانچ سو سے زائد مسجدیں ہیں۔

۲۸/ ستمبر صبح کے وقت ہم لوگ ہوٹل سے نکلے، جس ہوٹل میں ہمارا قیام تھا یہ بھی ایک دعوتی ساتھی کا تھا، یہاں دعوتی ساتھیوں کے جدید سہولیات سے آراستہ بہت سارے ہوٹل ہیں۔ قیام گاہ سے نکل کر ناشتے کے لیے ہمیں ایک دوسرے ہوٹل (زی شان یُو نَا) لے جایا گیا، یہ بھی ایک دین دار ساتھی (صالح) کا تھا، مگر تعجب خیز بات یہ تھی کہ یہاں بھی خدمت کے لیے خواتین (حجاب کے ساتھ) مامور تھیں۔ یہ یہاں کا بڑا مشہور ہوٹل ہے، چینی وزیر اعظم بھی آجائیں تو یہیں کھانا پسند کرتے ہیں، یہاں کام کرنے والوں کی تعداد سو ہے، اور

سبھی مسلمان ہیں جن کے لیے ایک کمرہ بھی مسجد کے طور پر اسی ہوٹل میں مخصوص کیا گیا ہے۔

وسیع وعریض میز پر انواع واقسام کے کھانے سجائے گئے تھے، اس طرح کہ آپ بیٹھیں تو متحرک میز پر ناشتہ خود آپ کے سامنے پہنچنے کے لیے بے تاب ہوتا، جن میں خصوصیت کے حامل کبوتر کے انڈے، سوپ، شوربہ اور کئی قسم کے مشروم تھے۔

ناشتے کے بعد ترتیب کے مطابق ہم لوگوں کا استعمال کیا گیا، اور سب کو الگ الگ رہبروں کے ساتھ مختلف جگہوں پر بھیج دیا گیا، مستورات میں گفتگو کے لیے مولانا فیصل صاحب کو منتخب کیا گیا، کسی اور جگہ مستورات سے خطاب کرنے کا موقعہ مولوی اطہر کو بھی ملا، مشورے کے مطابق دو رہبروں کے ساتھ ہمیں بھی بھیج دیا گیا؛ جاتے وقت یہ بتایا گیا کہ یہ حضرات عربی کی شد بد رکھتے ہیں مگر آگے چل کر یہ اندازہ غلط نکلا اور اشاروں ہی سے کام چلانا پڑا، سب سے پہلے مسجد السلام میں جانا ہوا جہاں امامِ مسجد مولوی محمد جمال الدین سے ملاقات ہوئی اور دعوت کے موضوع پر تبادلۂ خیال ہوا، کچھ ترغیبی گفتگو ہوئی، جوانِ صالح ہیں، عمر کوئی پینتیس سال معلوم ہوئی، ویسے تو چینیوں کی عمر کا صحیح اندازہ کافی دشوار ہوتا ہے؛ اس لیے کہ بڑی عمر میں بھی ضعف ان کو چھو کر نہیں گذرتا اور صحت کا بھی وہ کافی خیال رکھتے ہیں، مولوی جمال الدین ندوے کے نام و پیام سے متعارف نکلے، اور مجھ جیسے ایک ندوی سے مل کر کافی خوش ہوئے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے نام سے چین کا مذہبی حلقہ خوب واقف اور آپ کی جہد مستقیم اور فکر سلیم کا بڑا قدر دان ہے، انھوں نے اپنے یہاں سے طلبہ کو ندوے بھیجنے کا عزم ظاہر کیا، مسجد کے صحن میں ایک مدرسہ بھی ہے، مگر اس وقت طلبہ کے موجود نہ رہنے کی وجہ سے مدرسے کا جائزہ تو ممکن نہیں ہوا۔

یہاں سے فارغ ہو کر ایک اور مدرسے میں جانا ہوا جو یہاں کا مشہور مدرسہ ہے، یہاں کے امام صاحب مولوی احمد بہاؤ الدین ہیں جو استاذ بھی ہیں اور حیاۃ الصحابہ کے مترجم بھی یہی ہیں، شیخ داؤد کے صاحب زادے حافظ نقی نے تین سال یہاں رہ کر حفظ کی تکمیل کی ہے؛ اس لیے شیخ داؤد یہاں سے کافی مانوس ہیں۔ ان سے قبل مولوی عبد الغفور

صاحب یہاں کے ذمے دار تھے جن کا دس سال قبل انتقال ہوا ہے، ان کی کافی خدمات رہی ہیں، مولوی احمد تین سال سے یہاں خدمت انجام دے رہے ہیں۔ بڑے منکسر المزاج ہیں، اہل ہند کے بڑے قدر دان ہیں، مہمان نواز ہیں، روزے سے تھے اور یہاں ہم نے اکثر لوگوں کو روزے سے دیکھا؛ شاید عشرۂ ذی الحجہ کا اہتمام تھا۔

اس مدرسے میں ۸۰/ طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں، ۷/ اساتذہ ہیں، ثانویہ تک تعلیم ہے، مگر اسی میں صحاح ستہ، بیضاوی، ابن کثیر، احیاء علوم الدین، ہدایہ وغیرہ سبھی کتابیں پڑھادی جاتی ہیں۔ اس وقت تو صرف مولوی احمد صاحب سے گفتگو ہوئی البتہ شام کو پھر یہاں آنے کا اتفاق ہوا، اس وقت اطہر بھائی نے طلبہ سے کافی دیر خطاب کیا، جس میں پوری تاریخ اسلام کی روشنی میں دین اور دعوتِ دین کے لیے دی جانے والی قربانیوں اور استقامت وعزیمت کی داستانوں پر سیر حاصل روشنی ڈالی، اور طلبہ کے اندر بھی قربانی اور جاں فشانی کا جذبہ ابھارا، میراث رسول اور اس کی سچی جانشینی کا کیا حق ہے اور ایمان میں اضافے کے کیا ذرائع ہیں اس پر گھنٹہ بھر گفتگو رہی جس کا ترجمہ بڑی متانت، سنجیدگی اور ٹھہراؤ کے ساتھ مولوی احمد صاحب نے کیا۔ لڑکپن کا طالب علمانہ مزاج یہاں بھی موبائل میں مشغول نظر آیا۔

یہاں سے استقبال کے ایک مرکز میں جانا ہوا جہاں تنگشا کی جماعت موجود تھی، دین کی اہمیت اور قدر و منزلت پر ہم نے تھوڑی دیر بات کی، ترجمہ شیخ محمد احمد نے کیا جو یہیں کے باشندے ہیں، عالم ہیں، پاکستان اور بنگلہ دیش میں کافی وقت لگایا ہے؛ اس لیے اردو بھی کچھ کچھ جانتے ہیں۔ اس کے بعد کھانے کے لیے پھر اسی سابقہ ہوٹل (زی شان یُو نَا) جانا ہوا۔

اطہر بھائی دوسری جگہ گئے تھے، کچھ ساتھیوں سے ملاقاتیں کیں، ایک مدرسے میں بھی ان کا جانا ہوا جو ۱۹۴۰ء میں قائم ہوا تھا، اس وقت ۲۲۰/ طلبہ زیر تعلیم ہیں اور ۱۵/ اساتذہ ہیں جو سب کے سب چینی مدارس ہی کے فارغ ہیں۔

مولانا فیصل صاحب کی بھی دو تین ملاقاتیں رہیں، جن میں ایک نوجوان سے ملاقات خصوصی نوعیت کی حامل تھی، اس کے ذہن میں تبلیغ کے تعلق سے کئی اشکالات تھے

جن کے تشفی بخش جوابات مولانا کی زبانی سن کر وہ کافی خوش ہوا اور وقت لگانے کا اس نے وعدہ بھی کیا۔ اس کے علاوہ سلفیوں کے ایک مدرسے میں جانا ہوا جہاں شیخ اسحاق سے ملاقات ہوئی، کافی خوش ہوئے اور خندہ پیشانی سے ملے، انھوں نے پہلے چین پھر امارات میں رہ کر دینی تعلیم حاصل کی ہے اور اب کئی سال سے یہیں خدمت انجام دے رہے ہیں، سو کے قریب طلبہ زیر تعلیم ہیں۔

کھانے کے بعد اطہر بھائی کو مستورات میں خطاب کے لیے جانا پڑا جہاں انھوں نے ''**المرأة الصالحة**'' کے عنوان پر قیمتی خطاب کیا۔ اور ہم دونوں ایک اور مدرسے میں پہنچے جہاں ۴۰۰/۵۰۰ طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں، مدرسے کے ذمے دار مولوی امین بن عبدالغفور ہیں، ان سے ملنے کی خواہش تھی، اس لیے کہ ان کے والد شیخ عبدالغفور نے یہاں کافی خدمات انجام دی ہیں، مولانا فیصل صاحب نے بتایا کہ انھوں نے کسی کتاب میں ان کی حیات وخدمات کے بارے میں پڑھا ہے۔ مگر ملاقات نہ ہوسکی؛ اس لیے کہ وہ کہیں سفر پر تھے۔

یہاں سے ہم لوگ ایک اور ادارے میں پہنچے جس کا نام عربی میں جلی حروف میں ''معهد الدراسات الاسلامية'' تھا، اور ساتھ ہی چینی زبان میں بھی کچھ آویزاں تھا، جس کا ترجمہ پوچھنے پر معلوم ہوا ''معهد اللغات الأجنبية''۔ ۶۵۰/ طلبہ اور ۶۵۰/ طالبات زیر تعلیم ہیں۔ اس کے ذمے دار شیخ صالح عیسیٰ ہیں، اسلام آباد میں تعلیم حاصل کی ہے، چھ/ ٦ سال رہ کر ۱۹۹۲ء میں فارغ ہوئے۔ بڑے متواضع اور ملنسار ہیں، سلیم الفکر ہیں، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے بڑے عاشق اور آپ کی خدمات اور منہج سلیم کے بڑے قدر داں ہیں، اپنے پورے سفر میں جن چند حضرات کی ملاقاتوں کو ہم اپنے سفر کا حاصل سمجھتے ہیں ان میں ایک شیخ صالح عیسیٰ ہیں، ایسا متوازن اور معتدل عالم کم از کم ہم نے بہت کم دیکھا ہے، حضرت مولاناؒ کے ایسے عاشق بھی بہت کم دیکھے ہیں؛ اور خصوصاً چین کے دور افتادہ ملک اور وہ بھی شمالی چین کے اس حصے میں جہاں آج شاید پہلی مرتبہ کچھ ندویوں کے قدم پڑ رہے تھے، ایسے قدرداں شاید زندگی میں پہلی مرتبہ ان آنکھوں نے دیکھے۔

تری آواز مکّے اور مدینے

حضرت مفکر اسلامؒ کی شورشِ عندلیب کہاں کہاں پہنچی، ایک اللہ والے نے ہندوستان کے غربت کدے میں صور پھونکا اور چین کی وادیوں میں بھی اس کی صدا سنی گئی، امت مسلمہ کے لیے ایک اللہ کا بندہ تڑپتا رہا، کڑھتا رہا، ملت کی سربلندی کے لیے رات دن ایک کرتا رہا، علم وادب، دعوت واصلاح، تصنیف وتالیف کے ذریعے خدمت کرتا رہا، ذہن سازی اور کردار سازی میں مصروف رہا، انسانیت کا پیام بنی نوع انساں تک پہنچاتا رہا، سیاست کے ایوانوں تک اس کی آواز پہنچی، عرب میں اس نے روح پھونکی، اور ان کو اپنے مقام ومنصب سے آگاہ کیا، ادیبوں کو ان کی زندگی کا مشن بتایا، علم اور علماء کی خدمت کی، عقیدے اور عمل کی اصلاح کی، تقریر کے ذریعے دین کی خدمت کی، تحریر کے ذریعے دین کی خدمت کی، افراد سازی کا کارنامہ انجام دیا، مختلف محاذوں کے لیے افراد تیار کیے، الغرض یورپ وامریکہ میں اس کا آوازہ گونجا، ہندوپاک کے ضمیر کو اس نے جھنجھوڑا، عجم کی فضاؤں میں اس نے رنگِ حجاز بکھیرا، اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ صحراؤں کو عبور کرتے ہوئے، سمندروں اور دریاؤں کے جگر کو چیرتے ہوئے چین کی وادیوں میں اس کی صدا سنی جارہی ہے، اور اس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس کے کام وپیام کو سراہتے ہوئے اس کے طریقۂ دعوت اور اسلوب تربیت کو پسند کرتے ہوئے اس کی پیروی کی جارہی ہے اور معتدل فضاؤں کو برقرار رکھتے ہوئے پر امن ماحول کی قدر کرتے ہوئے اس کے متوازن طریقِ کار کو روبعمل لایا جارہا ہے، حضرت مولاناؒ نے ٹکراؤ کے راستے سے بچنے کے بعد معتدل اور پرامن فضا میں جس طرح کے نتائج کی توقع ظاہر کی تھی؛ آج چین کے اس ماحول میں بھی اس کے اثرات صاف محسوس ہورہے ہیں اور اس طریقِ دعوت کی افادیت اور معنویت پر اور انشراح بڑھتا جاتا ہے۔

بہرحال ان سے کافی دیر تک گفتگو رہی، شاید ڈیڑھ دو گھنٹے سے زائد یہ نشست رہی، بعد میں مولوی اطہر بھی یہیں آگئے، اور وہ بھی گفتگو میں شریک ہوگئے، شیخ ہندوستانی علماء اور بالخصوص اصالت ومعاصرت بالفاظ دیگر ''الجمع بین القدیم الصالح والجدید النافع'' کے داعی

علماء کے بڑے قدر دان اور اس کو ملک کے حالات میں ملت کے لیے بے حد مفید سمجھتے ہیں، اسی لیے حکومت سے بھی انھوں نے مصالحت کا رویہ رکھا ہے اور اپنے ادارے کا نام بھی عربی میں کچھ اور چینی میں کچھ رکھا ہے، اور طلبہ کے لیے وظائف بھی حکومت سے لیتے ہیں (تقریباً ۱۵۰۰ یوآن سالانہ فی طالب علم)، مگر اساتذہ کی تنخواہوں کے لیے حکومت سے رجوع نہیں کیا جاتا بلکہ عوامی چندوں سے اس ضرورت کو پورا کیا جاتا ہے۔

تبلیغ سے محبت رکھتے ہیں اگر چہ کہ براہِ راست شرکت نہیں ہے، اس لیے ساتھیوں نے ترغیبی گفتگو کا اشارہ دیا اور ہم لوگوں نے کی بھی، جس پر انھوں نے دقتوں اور دشواریوں کی بات سامنے رکھی، بہر حال ہر ایک کا اپنا انداز ہے جسے وہ اپنے علم ومطالعہ کی روشنی میں اپنے علاقے کی صورت حال کے پس منظر میں برتتا ہے اور ضروری نہیں کہ ہر ایک کو ایک ہی رنگ میں رنگ دیا جائے، اور مخصوص طریق کار پر مجبور کیا جائے، بلکہ بسا اوقات یہ حکمت کے اصولوں کے خلاف بھی ہوسکتا ہے، اور اس کے نتائج بھی کچھ اور نکلتے ہیں؛ اس لیے اصولوں سے انحراف کیے بغیر بنیادی چیزوں کو ملحوظ رکھ کر مناسب طریقہائے دعوت کو اپنانے میں ہر عالم اور داعی خود مختار رہے، یہی ہمارے بڑوں کا بھی شیوہ رہا ہے۔

اس ادارے کا قیام ۱۹۷۸ء میں عمل میں آیا جس کے بانی شیخ بہاؤالدین (م ۲۰۱۲ء) تھے، انھوں نے صرف مسجد کی تعلیم حاصل کی تھی، اور چینی زبان خود ہی سیکھی تھی، ایک ایسے وقت میں چینی زبان کی اہمیت انھوں نے محسوس کی جب مسلمان چینی زبان سے متنفر اور متوحش تھے، مگر وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اور مستقبل کی ضرورت کو بھانپتے ہوئے انھوں نے اس کی طرف توجہ دی، اور یہی حال اکثر ملکوں کا ہوتا ہے؛ یہ ایک بڑا المیہ ہے اس امت اور بالخصوص آخر کی صدیوں کا جب ملت کا ستارۂ اقبال غروب ہوگیا، اور اس کے شجرِ سایہ دار کو گھن لگ گیا، اس کی پرواز پر قدغن لگ گئی اور اس کی ترقی اور سر بلندی کا سفر بھول بھلیوں میں کھو گیا' امت نے وقت کے رہتے ہوئے زبانوں کی اہمیت کو سمجھنے میں کوتاہی کی، زبانوں سے یہ نفرت کسی ردِ عمل کا نتیجہ تو ہوسکتا ہے اور مخصوص حالات میں اس

کے لیے عذر بھی تلاش کیا جاسکتا ہے مگر اس ردِّ عمل کو عارضی ہی رہنا چاہیے اور مؤمن کی نگاہِ بصیرت کو آنے والے فتنے صاف نظر آنے چاہئیں، زبانوں کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے سیرتِ رسول کے مطالعہ سے بھی رہنمائی ملتی ہے اور خود قرآن کی آیت ﴿اِلّا بلسانِ قومه﴾ اس کے لیے روشن دلیل ہے۔

شیخ صالح ملے، بڑے تپاک سے ملے، خوش ہوئے، دل سے خوش ہوئے، اکرام کیا، بے حد اکرام کیا، اپنے ہاتھوں ہی سے چینی چائے بنا کر پلاتے رہے، اور کھجوروں کے خوشے دل کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیے، اتنے بڑے ادارے کے ذمے دار ہو کر بھی اس طرح تواضع کے ساتھ ہم لوگوں کی خدمت کرنا شاید انھیں کا حصہ تھا۔ ندوے کی بھی دل کھول کر تعریف کی، اور اس کے اصولوں سے اپنی ہم آہنگی کا اظہار کیا، اور حضرت مولاناؒ سے اپنی مراسلت کا بھی ذکر کیا۔ یہ سب باتیں ہم لوگوں کے لیے کسی انکشاف سے کم نہ تھیں۔ حضرت مولاناؒ کی تقریباً سبھی کتابیں پڑھ رکھی ہیں، جس کتاب کا ہم نام لیتے اس کو پڑھنے کا ذکر کرتے، انھوں نے ''ماذا خسر'' کے چینی ترجمے کا بھی ذکر کیا، مگر ساتھ ہی اپنی قیمتی رائے بھی ظاہر کی کہ ترجمہ صحیح نہیں ہو پایا ہے، اس لیے کہ انگریزی کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے۔ مولانا رابع صاحب دامت برکاتہم کے متعلق بھی دریافت کیا۔ ندوے میں اپنے یہاں کے طلبہ کو بھیجنے پر بھی آمادگی ظاہر کی۔ چین کی صورت حال پر بھی گفتگو ہوئی، تاریخ الاسلام فی الصین کا ایک نسخہ ہمیں عنایت کیا جو محمود شمس الدین (تشانغ تشیھوا) کی تالیف ہے۔ We Chat پر بڑے بڑے علماء کی رہنما تحریروں کے ذریعے بھی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

شیخ صالح کی ملاقات سے بے انتہا خوش ہو کر ہم نے انھیں ہندوستان آنے کی دعوت دی، اور انھوں نے اس کو قبول بھی کیا، خدا کرے کہ جلد ہی کوئی اس کی سبیل نکل آئے اور یہاں کے اداروں سے استفادے اور افادے کی راہ ہموار ہو۔

اس بہترین ملاقات کی خوش گوار یادیں لے کر ہم وہاں سے واپس ہوئے اور عصر کے لیے وہیں کی ایک مسجد میں داخل ہوئے اور نماز سے فارغ ہوئے، یہاں کی اکثر

مسجدوں میں سلام کے بعد نمازی پوری مسجد میں منتشر ہوکر بیٹھتے ہیں اور ذکر واذکار کے بعد
پھر امام صاحب دعا کرتے ہیں اور سب اس پر آمین کہتے ہیں، امام صاحب کا بھی ایک
مخصوص لہجہ ہوتا ہے، یہ بات ہم نے یہاں اکثر جگہوں پر محسوس کی۔

کچھ اور ملاقاتیں

اس کے بعد ایک دعوتی ساتھی نوح کے یہاں جانا تھا، جہاں پر انھوں نے کچھ ایسے
لوگوں کو مدعو کیا تھا جو قادری سلسلے سے متعلق تھے، تبلیغ کے قدر دان تو ہیں مگر پوری طرح
منشرح نہیں ہیں اور ذہنوں میں بہت کچھ تحفظات بھی رکھتے ہیں، عام جگہوں پر تو ان سے
ملاقات ممکن نہ تھی؛ اس لیے اس خصوصی نشست کا اہتمام کیا گیا تھا۔

ان میں ایک تو شیخ محمود تھے جو یہاں کسی مسجد کے امام تھے، دوسرے جواں سال اور
فعال مولوی ہلال الدین نقشبندی تھے، انھیں سے گفتگو رہی، ۴/ سال ازہر اور ۲/ سال جامعۃ
القاہرہ میں رہ کر کلیۃ التفسیر سے ۵/ سال قبل فارغ ہوئے ہیں۔ جیسے ہی ہم نے حضرت
مولاناؒ کا ذکر کیا فوراً ''رجال الفکر والدعوۃ'' سے اپنے تاثر کا اظہار کیا، بہت خوش ہوئے،
اور حضرت مجدد الفِ ثانیؒ سے اپنی عقیدت اور محبت کا ذکر کرنے لگے، آپؒ کے خاندان کے
بارے میں اور آپ کے خلفاء کی خدمات کے بارے میں بھی گفتگو کرتے رہے، کاشغر کے
بارے میں انھوں نے بتایا کہ حضرت مجدد صاحبؒ کے تین خلفاء یہاں تشریف لائے تھے،
انھیں کے سلسلے کے ایک بزرگ عبد الکریم کاشغری ابھی بقید حیات ہیں، کافی عمر رسیدہ
ہیں۔ گفتگو اکثر بزرگوں کے متعلق رہی، حضرت مجدد صاحبؒ کے عہد اور اکبر کے دور کے
متعلق بھی کچھ جاننا چاہا جس کے لیے مولانا فیصل صاحب انتہائی موزوں تھے، مولانا نے
کافی معلومات فراہم کیں، حضرت سید احمد شہیدؒ کے چینی خلفاء کے متعلق جاننے میں یہاں
بھی ہم لوگوں کو کامیابی نہیں ملی۔ مولانا عبد الرحمٰن کاشغری ندوی کی ندوے میں آمد اور
طالب علمی کا ہم نے ذکر کیا، جس پر انھوں نے اپنے علم کا اظہار کیا مگر ہمارے اندازے کے
مطابق انھیں اس کے متعلق صحیح جانکاری نہیں تھی، اس لیے خلط مبحث ہوگیا۔ یہاں کے

حلقوں میں حضرت مجدد صاحبؒ سے بے پناہ عقیدت ہے، آپ کے مکتوبات کو یہاں بڑی
مقبولیت حاصل ہے، خود چینی زبان میں اس کا ترجمہ بھی ہم نے دیکھا۔ ہندوستان آنے اور
سرہند دیکھنے کی اپنی خواہش کا انھوں نے اظہار کیا۔

ہم لوگوں نے دعوت سے متعلق بھی ذہن صاف کرنے کی کوشش کی مگر اندازہ یہ ہوا
کہ یہ کام بڑا دیرپا ہے اور دقت طلب، اور مولوی صاحب کافی منجھے ہوئے ہیں، اتنی آسانی
سے کام ممکن نہیں ہے۔ ہم نے حیاۃ الصحابہؓ پڑھنے کی ترغیب دی تو انھوں نے سیرت سے
رہنمائی پر ہمیں ابھارا، حالاں کہ یہ ان کی غلط فہمی ہے اور یہ صرف انھیں کی بات نہیں، بہت
سارے لوگوں کو غلط فہمی ہوجاتی ہے کہ وہ سیرتِ صحابہؓ سے بے نیاز ہونا چاہتے ہیں، جب کہ
سیرتِ رسولؐ یقیناً مینارۂ نور ہے اور اسی کے لیے تو سارے جتن ہوتے ہیں، ساتھ ہی سیرتِ
صحابہؓ کو بھی پڑھنے کی ضرورت ہے کیوں کہ یہ سب دیے اسی ایک مشکوٰۃ نبوت ہی سے جلے
ہیں اور آفتاب رسالت کی ہی نوری کرنیں ہیں جن سے صحابہؓ نے کسب فیض کیا ہے، اور
سیرتِ صحابہؓ سے بے نیاز ہوکر سیرتِ رسول کو سمجھا نہیں جاسکتا۔

جب سیرت کی بات آئی تو سیرت کے اتباعِ ظاہری و باطنی کی ہمیں ترغیب دینے
لگے، بات تو صحیح ہے اور اس کی یقیناً ضرورت ہے، مگر مولوی صاحب کو یہ بات پتہ نہیں
کیوں سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ دعوت کے لیے تڑپ اور کڑھن بھی سیرت ہی کا ایک بھولا ہوا
سبق ہے اور اس کا ظاہر کے بجائے باطن ہی سے زیادہ تعلق ہے۔

پھر نبی اور امتی کا فرق بھی ہمیں سمجھانے لگے جیسا کہ اکثر بدعتی حلقوں کی طرف سے
یہی کہہ کر اتباعِ سنت سے دامن بچانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ کہاں اتباعِ سنت اور
کہاں ہم گنہ گار، بھلا ہم اتباع کرسکتے ہیں۔ یہ ایک مغالطہ اور دھوکہ ہے جو شیطان کی طرف
سے ذہنوں میں ڈالا جاتا ہے اور اس کی وضاحت کے لیے ہمیں کوئی دلیل دینے کی
ضرورت نہیں ہے، کتاب وسنت اس کے لیے شاہد عدل ہیں۔

مولوی صاحب کی باتوں میں کچھ تضاد بھی نظر آرہا تھا، انھوں نے اتنی ساری باتیں

کہیں مگر چہرہ سنت کے نور سے خالی تھا۔

یہاں میزبان نے تمام مہمانوں کو کچھ نقدی ہدیہ کی، غالباً ان شیوخ کی راہ ورسم کا لحاظ کیا جا رہا تھا، ہم کو بڑا تعجب ہوا اور لینے میں کافی ہچکچاہٹ بھی ہوئی اس لیے کہ ہماری افتادِ طبع اور خود دعوت کا مزاج اس کی اجازت نہیں دے رہا تھا، مگر رہبروں کے چشم وابرو کے اشارے پر بادل ناخواستہ قبول کرنا پڑا؛ کیوں کہ آج دعوت کی مصلحت ہی اس کی داعی تھی۔ بعد میں شیخ داؤد نے بتایا کہ دعوتی ساتھی اس سلسلے میں کافی محتاط اور بیدار مغز ہیں، جہاں تقاضہ قبول کرنے کا ہوتا ہے اور قبول نہ کرنے سے دعوت کا مفاد متاثر ہوسکتا ہے وہاں قبول کر لیتے ہیں اور جہاں قبول نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا وہاں گریز کر لیتے ہیں، ان کی یہ بات بھی اچھی معلوم ہوئی، ورنہ جائز کاموں کے لیے خواہ مخواہ کی لڑائی برپا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اسی طرح کی ایک اور بات ہمارا رفعِ یدین کو ترک کرنا بھی تھا، ساتھیوں نے (مدارس کو چھوڑ کر جہاں پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ ہے) عوامی مساجد میں رفعِ یدین سے احتیاط کی تلقین کی کہ عوام خواہ مخواہ تشویش کا شکار نہ جائیں اور اس سے دعوت کے کاز کو نقصان نہ پہنچ جائے؛ شروع شروع میں ہمارا دھیان اس طرف نہیں تھا اس لیے عوام کی نگاہیں ہماری طرف اٹھ کے رہ جاتی تھیں، چوں کہ چین کی اکثریت حنفی المسلک ہے اس لیے فروعیات میں بھی وسعت قلبی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے وہ مسلک کی پابندی کو انتظاماً ضروری سمجھتے ہیں، (البتہ مدارس اور بالخصوص دعوتی حلقوں میں اس کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا جاتا ہے، اور عوام کی حد تک یہ ضروری بھی ہے، ورنہ یہ ایک مصیبت کا پیش خیمہ ہوسکتا ہے جس کی بلا خیزی سے آئے دن برصغیر جوجھ ہی رہا ہے)۔

مغرب کی نماز کے لیے مولوی احمد بہاؤ الدین کے مدرسے میں جانا ہوا، جہاں مغرب بعد اطہر بھائی کی گفتگو طے تھی، جس کا تذکرہ سطورِ بالا میں ہو چکا ہے، طلبہ کا ترتیب سے بیٹھنا مثالی تھا، ایک تعجب خیز بات طلبہ کی رواتب میں بھی امام کی اتباع دیکھنے کو ملی۔

مولانا فیصل صاحب کا ایک دوسری جگہ جانا ہوا جہاں ۵۰/۶۰ افراد جمع تھے، ایمان

ویقین پر مولانا نے بات کی، ۱۵/ ساتھی نقد تیار ہوئے۔

عشاء سے فارغ ہو کر دن بھر کے تھکے مسافروں نے ہوٹل کی راہ لی۔

۲۹/ستمبر کی صبح فجر کی نماز کے بعد رخت سفر تیار کیا گیا، کیوں کہ آج علی الصباح شیننگ کے لیے نکلنے کا اشارہ مل چکا تھا، ابھی کچھ کسر باقی تھی اس لیے مشورے کے مطابق ایک اور مرکز استقبال میں جانا طے پایا جہاں گفتگو کی باری اب کی میری تھی، چھ صفات سے متعلق کچھ باتیں بزرگوں سے سنی ہوئی یاد تھیں وہ دہرا دیں، ترجمہ مولوی عادل نے کیا، گفتگو گھنٹہ بھر چلی۔

چینی ولیمہ

اب یہاں کا ایک ولیمہ بھی مقدر میں تھا، اس لیے وہیں چل پڑے، اور ولیمہ سے بلکہ اس کی رنگارنگی سے محظوظ ہوئے، کیا پر تکلف ولیمہ تھا، ہر ایک کے بس کی بات نہیں کہ چینیوں جیسا ولیمہ کرے اور چینیوں جیسا ولیمہ کھائے، کس قدر کھانے کی ریل پیل، بس توبہ! ایک طرف مہمان نوازی کا اندازہ ہو رہا تھا دوسری طرف اسراف کا بھی شبہہ ہو رہا تھا اور پھر طرفہ تماشا یہ کہ یہاں بھی پیسے نچھاور کیے گئے۔ میوہ جات، اخروٹ، ہیزل نٹ، مٹھائی، کباب، سوپ، شوربہ، گوشت، برّی وبحری مشروم، جنگلی سیاہ مرغ، سمندری سبزیاں اور ساگ؛ کیا کچھ نہیں تھا اس دسترخوان پر، معدے نے ساتھ نہیں دیا اس لیے بقدرِ جثہ ہی پر اکتفا کرنا پڑا۔ تعجب خیز بات یہ بھی تھی کہ دولہے میاں خود خادم بن کر ماکولات ومشروبات کے دَور چلاتے رہے۔

اور ہم لنشیا سے نکلے

لنشیا کی سرزمین پر چلنے پھرنے کے بعد اور یہاں کے دینی اداروں کو دیکھنے کے بعد دل میں یہ خیالات ابھر رہے تھے جو الفاظ کے پیکر میں ڈھلنے کے لیے بے تاب سے رہے: عظمت گم گشتہ کا سراغ لگانے کے لیے کچھ غریب الدیار ہندی چین کی وادیوں میں نکلے ...خاکِ کاشغر کے قریب پہنچے... مگر شاید اس بار کاشغر کو اشکوں کا نذرانہ نہ دے پائیں، پھر بھی خاکِ چین میں پنہاں تاریخ کی ٹوٹی ہوئی کڑیاں جوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں... آہ کیا ترکمانی شکوہ

تھا...کیا تہذیبی ورثہ تھا جو خاک میں مل گیا... پھر بھی ابھی کچھ چنگاری اس خاکستر میں ہے..ابھی آبِ رودِ چین کو وہ دن یاد ہیں جب اس پر کاروانِ ایمان خیمہ زن ہوا تھا...اس لیے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی۔ثقافتی انقلاب کی تباہ کاریوں کے بعد بھی اس خاک میں ایمانی وراثت کے ذرات باقی ہیں...جو منتظر ہیں کسی مسیحا نفس کے..جو اس خاکستر میں زندگی کی روح پھونک دے..اور ''حکمتِ ایمانیاں'' کو ملحوظ رکھ کر یقینِ محکم کی قندیل لے کر عمل پیہم کو شیوہ بنائے...محبت کو دل میں بسا کر دلوں کو فتح کر لے...اور ابر رحمت بن کر افق پر چھا جائے، اور تہذیب وثقافت کے بیماروں کے ہاتھ میں داروئے شفا دے دے...حالات کو دیکھ کر جہاں اندیشے جھلک رہے ہیں وہیں امید کے جگنو بھی چمک رہے ہیں۔خدا اس ملک میں اسلام کا بول بالا کرے اور جدوجہد کرنے والوں کو اس کا اجر عطا فرمائے۔آمین۔

شینگ کے راستے میں

لنشیا سے محبت کی سوغات لے کر، یہاں کی مہمان نوازی سے متاثر ہو کر اور یہاں کے دینی مستقبل کے تئیں نیک تمنائیں لے کر ہم لوگ دس بجے کے قریب سوئے شینگ چل پڑے، چلتے وقت شیخ داؤد نے کہا کہ کافی طویل مسافت ہے؛ تقریباً ۴۰۰/کلومیٹر کا سفر ہے، ایکسپریس وے پر چلیں یا پہاڑی راستے کو منتخب کریں، اختیار کا ملنا تھا کہ دل کی آواز زبان پر آگئی کہ بالکل، پہاڑی راستے ہی کو اختیار کیا جائے اور جمالِ فطرت سے محظوظ ہوا جائے، آنے والے وقت نے ثابت بھی کر دیا کہ ہمارا فیصلہ بالکل صحیح اور مناسب تھا۔

خواہش کے مطابق رہبر نے اسی راستے کو منتخب کیا جو جنگلات، پہاڑوں اور دیہاتوں سے ہو کر گذرتا تھا، اور ہنگاموں کی دنیا سے بے خبر تھا، تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ روئے فطرت نے نقاب سرکائی، فطرت کی بہارِ رنگیں شباب پر آئی، پہاڑوں نے اپنے حسن کا جلوہ دکھانا اور ہم نے اونچائی پر چڑھ کر ان کا تماشا دیکھنا شروع کیا، رواں آبشار تھے، حسیں کوہسار تھے، دل کشا مرغزار تھے، جاں فزا گل وگلزار تھے؛ مزاجِ یار کی برہمی نے طبیعت میں جو افسردگی پیدا کی تھی جمالِ فطرت کے دل ربا نظارے نے اسے نشاط سے بدل

دیا، نسیمِ صبح کی مہربانی نے کیف وسرور کی کیفیت پیدا کر دی، وادیِ چین کے ان کہساروں کو مصورِ ازل نے وہ لباسِ زینت بخشا ہے اور دلکشی ورعنائی کی وہ گلگشت عطا کی ہے کہ جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اس سفر میں واقعی مزہ آگیا، اس دوران اتنے رنگ برنگے پہاڑ دکھائی دیے کہ قرآنی آیت ﴿ومن الجبال جدد بيض وحمر مختلف ألوانها وغرابيب سود﴾ مجسم نظر آئی۔اپنے تجربات کے مختصر سے سفر میں اب تک بیک وقت اور یکجا اتنے رنگا رنگ پہاڑ کبھی نہیں دیکھے تھے، کہیں پہاڑوں کی فطری محرابیں تھیں کہ لگتا تھا گویا ہم محرابوں کے شہر میں ہیں، کہیں انسان نما پہاڑوں کی قطاریں تھیں کہ محسوس ہوتا تھا گویا ہم نشینوں کی مجلس سجی ہے اور ایک دوسرے سے محوِ گفتگو ہے، بلکہ ایک جگہ پر تو حجلۂ عروسی کا جلوہ بھی نظر آیا، دور پہاڑ کی چوٹی پر پہاڑوں کا ایک جوڑا محبوب کی دلداری اور ناز برداری میں مصروف، اور راز ونیاز کی باتوں میں مشغول تھا۔

بعض دیوہیکل اور طویل القامت پہاڑوں کے درمیان سے گذرے تو ہمیں اپنا قد کافی بونا نظر آیا، انسان بھی عجیب ہوتا ہے جب تکبر پہ اترتا ہے تو لگتا ہے اس کے قدم زمین ہی پر نہیں ہیں، ایسے انسانوں کو چاہیے کہ ان پہاڑوں کی کوکھ میں آکر اپنے قد کا موازنہ کر لیں۔بعض پہاڑوں کے خوفناک دہانے آہنی پشتوں سے ڈھکے ہوئے نظر آئے، پتہ چلا کہ فوجی اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

دھیرے دھیرے پہاڑ کی بلند ترین چوٹی پر پہنچ گئے، رہبر نے خطرے کا الارم بجایا کہ اب آکسیجن کی کمی کی وجہ سے کچھ گھٹن اور سر میں درد سا محسوس ہو سکتا ہے، مگر شکر ہے کہ ایسی ہر تکلیف سے اللہ نے حفاظت فرمائی۔ پہاڑوں کی اونچائی سے گذرا ہوا راستہ کبھی تو سانپ کی ٹیڑھی رفتار کی طرح نظر آرہا ہے اور کبھی یہ کھیتوں کی خوب صورت پگڈنڈیاں معلوم ہو رہی ہیں۔اب ہم اتر رہے ہیں اور صوبۂ کانسو سے نکل کر صوبہ چھینگ ہائی میں داخل ہو رہے ہیں، اس دوران مولوی عادل کی دعوتی کارگزاریاں ایمان میں اضافہ، اور عزائم کو مہمیز کر رہی ہیں اور اپنی کم مائیگی، نالائقی اور کوتاہ نظری وکوتاہ عملی کا احساس بھی دلا رہی

ہیں، ایسے میں سفر کی تھکاوٹ کا احساس جاتا رہا اور وقت بھی تیزی کے ساتھ گذرتا رہا۔

راستے میں کئی بستیوں کو سلام کرتے ہوئے گذرے، شیخ داؤد تعارف کراتے رہے، قدیم چینی نقش ونگار سے آراستہ لکڑی کی مسجدیں کافی نظر آئیں، مسلم اکثریت والے شہر بائی بونڈ سے بھی گذرے، شونگ خو میں تھوڑی دیر کے لیے رکے جہاں شیخ داؤد کو کوئی کام تھا، یہاں کے باسیوں کی صورتیں چینی شکل سے کچھ مختلف نظر آئیں، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہاں ترکمانی النسل خاندان آباد ہیں، ترکمانی نسل کے قبیلہ سالا (جن کو بقول ہمارے رہبروں کے، غلطی سے بعض مؤرخین نے سالار لکھ دیا ہے) کے افراد نے یہاں آکر شادیاں کیں اور یہیں بس گئے، زبان بھی یغوریوں سے ملتی ہے۔ ایک بڑی سی خوب صورت مسجد کو دور سے دیکھا جس کے امام صاحب کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ ایران سے فارغ ہیں، تبلیغ سے محبت رکھتے ہیں، تصوف کے سلسلے سے وابستہ ہیں۔

مختلف جگہوں پر مرکز استقبال بھی دکھائی دیے جن میں دین چانگ کا مرکز قابل ذکر ہے، یہیں کہیں پر ۱۴۰۰/ سال قبل کا مصحف عثمانی کا کوئی نسخہ بھی موجود ہے، دیکھنے کی خواہش ظاہر کی مگر رہبروں نے معذرت کی اور اسے کافی دیر طلب اور دشوار ترین کام گردانا۔ ’’قریۃ الامام‘‘ نامی ایک گاؤں سے گذرے تو معلوم ہوا کہ یہاں سات سو سال قبل علماء کا جم غفیر تھا اس لیے اسے ’’قریۃ الامام‘‘ اور یہاں کے پل کو ’’جسر الامام‘‘ کہا گیا۔

ایک یادگار دعوت

پھر ایک جگہ رکے تو بتایا گیا کہ یہاں مرکز استقبال ہے، یہیں نماز سے فارغ ہونا ہے، اور ایک ساتھی نے اکرام کی بھی دعوت دی ہے۔ بالکل لب سڑک مگر درختوں کے جھرمٹ میں ایک مکان قدیم طرز تعمیر کا نمونہ، لکڑی سے بنا ہوا ہے، جہاں جماعتیں آکر قیام کرتی ہیں اور اعمال کی محنت کرتی ہیں، تبلیغ والے بھی کہاں کہاں پہنچ جاتے ہیں، کوئی قریہ چھوڑا، نہ گاؤں، جنگل چھوڑا نہ شہر، آبادی چھوڑی نہ ویرانہ، ہر جگہ اللہ کے دین کا پرچم لے کر پہنچ گئے اور احیائے اسلام کی کوششوں میں مصروف ہیں، انھیں نہ کڑاکے کی سردی کی

پروا ہے نہ چلچلاتی دھوپ کی، انھیں نہ بیابانوں کی ویرانی روک سکتی ہے نہ طوفانوں کی طغیانی، نہ غاروں کی گہرائی ان کے پیروں میں زنجیر ڈال سکتی ہے نہ پہاڑوں کی اونچائی، نہ جدتوں کا طلسم انھیں شیشے میں اتار سکتا ہے نہ قدامتوں کا گھن انھیں کھا سکتا ہے، نہ تہذیبوں کی رنگارنگی انھیں مرعوب کر سکتی ہے نہ زمانے کی نیرنگی ان کے پائے استقلال میں جنبش لا سکتی ہے۔

نماز کے بعد جس کے یہاں دعوت میں حاضر ہوئے (سرکہ کی فیکٹری کے مالک) اس شخص نے تو دل نکال کر رکھ دیا، اس کا یہ اکرام کبھی نہیں بھول سکتے، یہ ایک یادگار دعوت تھی، دل کا خلوص لذت کو دوبالا کر رہا تھا، صرف ایمان کی نسبت تھی جس کی تفسیریں یہاں کے آفاق میں ہمیں نظر آ رہی تھیں، ایمان اور اہل ایمان سے محبت کے سوا اس کی اور کیا توجیہ ہو سکتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے جس لڑی میں تمام اہل ایمان کو پرویا ہے اس نے رنگ ونسل کے تمام بت پاش پاش کر دیے، ایرانی اور تورانی، خراسانی اور افغانی کا فرق مٹایا، عرب وعجم کو گلے لگایا، کالے کو گورے سے ملایا، اسی وحدت واخوتِ ایمانی کا فیض آج ہمیں چین کے ان کہساروں میں صاف نظر آ رہا تھا کہ وہاں کے دور افتادہ دیہاتوں میں بھی نسبت ایمان سے مربوط ہزاروں کلومیٹر دور کے ہم اجنبیوں اور غریب الوطنوں کو گلے لگایا جا رہا تھا اور جان ودل فدا کیے جا رہے تھے۔

اس دعوت کی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں کی ہر چیز دیسی تھی، بکرا دیسی، مرغ دیسی، سبزیاں دیسی، میوہ جات اخروٹ وغیرہ دیسی، پھل فروٹ دیسی، میٹھے بیر، مزے دار کاکا، انگور، سیب، مسالہ والی مرچ تک دیسی، نہ صرف دیسی بلکہ یہ سب چیزیں ان کے اپنے کھیت کی پیداوار۔ یہ چیز بڑی قابل تقلید ہے اور خاص طور پر چین کے ماحول میں اس طرح کے رویے سے ایک طرف دیسی چیزوں سے ان کا شغف دکھائی دیتا ہے تو دوسری طرف صاف طور پر ان کا تقویٰ واحتیاط اور دین سے محبت بھی نظر آتی ہے۔ اور یہاں چین میں دعوت کا ہر ساتھی ماکولات ومشروبات میں تقریباً اسی طرح کا محتاط رویہ اختیار کرتا ہے جو قابل قدر بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔

کھانے کے بعد

اس یادگار دعوت کی خوش گوار یادیں لے کر میزبان کے حق میں دعائے خیر کرتے ہوئے وہاں سے نکلے اور پھر شیننگ کا راستہ پکڑا۔ کبھی ہموار سڑک پر ہماری کار فراٹے بھر رہی تھی، کبھی ناہموار اور دشوار گذار راستے پر بڑھتی چلی جارہی تھی۔ شیخ داؤد کی معلومات سے بھر پور ظریفانہ گفتگو، اور مولوی عادل کی ایمان افروز کارگذاریاں دلچسپی کا باعث بن رہی تھیں اور سفر کی تھکن کو کافور کیے دے رہی تھیں۔ آگے ایک گاؤں سے گذر ہوا جس کا نام ''خاکہ اخون'' (یعنی بڑے عالم) تھا، جہاں پانچ سال قبل ''Hualon'' (چینی تلفظ) نامی ایک صاحب زہد وتقویٰ، عربی کے بڑے عالم گزرے ہیں، یہاں ''اخون'' عالم کو کہتے ہیں جو فارسی زبان سے آیا ہے، یہی نہیں بلکہ بہت سارے الفاظ چینی میں فارسی کے پائے جاتے ہیں خاص طور پر مذہب کی کئی اصطلاحات مثلاً نمازوں کے نام فارسی کے ہیں، پیشیں، خفتن، شام وغیرہ سب فارسی کے الفاظ ہیں، انھیں ''اخون'' کی مناسبت سے گاؤں کا نام ہی ''خاکہ اخون'' (یعنی بڑے عالم) پڑ گیا، یہ عربی زبان کے بڑے عالم تھے، تعجب کی بات یہ ہے کہ خالص چینی مسجدوں کے تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود عربی سے اتنا تعلق قائم کیا کہ لوگ آج انھیں عربی کے سب سے بڑے چینی عالم کے طور پر یاد کرتے ہیں، کئی کتابیں عربی میں لکھیں، خطوط بھی عربی میں لکھے، ان کے خطوط کا نمونہ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا، خوش خطی میں بھی طاق تھے۔

دورانِ سفر بدھسٹوں کے بارے میں ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ ان کے یہاں بھی پارسیوں کی طرح مردے کو کاٹ کر کھلے میدان میں گدھ کا نوالہ بنایا جاتا ہے۔ ایک چیز چینیوں کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوئی کہ وہ ٹائی کا استعمال بالکل نہیں کرتے اور خود ہم نے اس کا مشاہدہ کیا۔

شیننگ میں

Ping'an نامی علاقے سے گذرتے ہوئے شیننگ پہنچے، شیننگ صوبۂ چھینگ ہائی کا ایک ضلع ہے، وہاں کے باشندوں کے بقول پورے صوبہ کی آبادی ۷/ ملین اور مسلم تناسب

تقریباً ۲۵/ فیصد (یعنی ڈیڑھ سے دو ملین مسلم آبادی) ہے، شیننگ میں ۲۰/ لاکھ کی آبادی میں ۶/ لاکھ مسلمان ہیں، آس پاس ۵۰۰/ سے زائد مساجد ہیں، بیچ شہر میں ۴۶ مسجدیں ہیں۔

شیننگ میں ہماری منزل بھائی یعقوب کا مکان تھا، جہاں قیام کرتے ہوئے مختلف ملاقاتوں کا پروگرام تھا، بھائی یعقوب نے بنگلہ دیش میں چار ماہ لگائے ہیں؛ اس لیے کچھ اردو کے الفاظ سے شناسائی ہے، اشاروں کی زبان ہی زیادہ تر استعمال کرنی پڑی یا پھر مولوی عادل کو مترجم بنایا گیا، بڑے مہمان نواز واقع ہوئے، ہر ممکن آرام اور راحت رسانی کی فکر کی، اور پوری خاطر کی۔

یہاں پہنچ کر نماز وغیرہ سے فارغ ہوئے، احباب ملنے آئے؛ جن میں سب سے نمایاں حسین، ایوب، حسن، یوسف، شعیب وغیرہ صاحبان تھے، سب یہاں پر دعوت کے فعال اور متحرک کارکن ہیں۔ عشاء کے بعد مولانا فیصل صاحب کو بعض ملاقاتوں کے لیے لے جایا گیا اور ہم کو آرام دے دیا گیا۔

مختلف ملاقاتیں

۳۰/ستمبر کی صبح شیخ صالح اخون کے مکان پر اجتماع تھا، سو کے قریب افراد جمع تھے، یہاں کی ہر مجلس میں تقریباً ۶۰/ ۷۰ افراد ضرور شریک رہتے، شیخ صالح اخون یہاں کے ذمے داروں میں سے ہیں، عالم بھی ہیں، یہیں کسی مدرسے کے فارغ ہیں، مگر دعوت کے پرانے ساتھیوں میں سے ہیں۔ مولانا فیصل صاحب کے نام قرعۂ فال نکلا اور یوں بھی مولانا ہی اس کے لیے زیادہ موزوں تھے کہ تقریروں اور بیانوں سے وابستگی مولوی اطہر اور ہمارے مقابلے میں مولانا ہی کی زیادہ تھی۔ مولانا نے دین کے لیے قربانی کی ضرورت، رسول اللہ ﷺ کی ہجرت اور اس کے دوررس اثرات، شعب ابی طالب میں دی گئی اذیتیں اور مشقتیں، ان موضوعات پر بڑے رقت آمیز انداز میں خطاب کیا، مترجم مولوی عادل پر گریہ طاری ہو گیا اور وہ آب دیدہ ہو گئے، کسی طرح بات مکمل کی اور مجلس برخواست ہو گئی۔

یہاں جن حضرات سے ملاقات ہوئی ان میں عبد اللہ اخون خصوصیت سے قابل ذکر

ہیں، یہ بھی شینگ کے اہم ذمے داروں میں ہیں، اور شیخ داؤد کے رفیق ہیں، اس وقت سے ہماری روانگی تک مستقل ساتھ رہے۔ کافی دیر تک چین کی صورت حال اور دعوت اسلامی کے لیے درپیش مسائل اور امکانات پر تبادلۂ خیال کرتے رہے، اور بہت ساری کارگذاریاں بھی سنائیں، جن میں شہر فجین کا تذکرہ بڑا مؤثر تھا؛ فجین جنوبی چین کا وہ علاقہ ہے جہاں بعض اقوال کے مطابق صحابۂ کرام کے قدم مبارک پڑے تھے اور آج اسی جگہ ارتداد کا حملہ ہے، سبھی لوگ مرتد ہو گئے تھے، پرکھوں نے مسجد کی چھت پر لاکر قرآن کو آویزاں کردیا تھا، اور اسلام کی کسی چیز سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا، اب جماعتوں کی آمد ورفت کی برکت سے الحمدللہ ۴۰/ لوگوں نے دوبارہ اسلام قبول کرلیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کافی دردانگیز باتیں بتائیں جن سے ان کے قلب دردمند کا اندازہ ہوا، اور بعد میں تو بہت زیادہ ان کی اور شیخ داؤد کی داعیانہ خدمات کا تذکرہ سنا اور بچشم خود مشاہدہ بھی کیا۔

یہاں سے فارغ ہوکر عبداللہ اخون کے ساتھ ہی مختلف اداروں اور مسجدوں کی زیارت کے ارادے سے نکلے، بازار بھی ہوآئے جہاں سے مساج کے کچھ آلات خریدے گئے، اور جامع مسجد میں پہنچ کر ظہر کی نماز ادا کی گئی، یہاں کی جامع مسجد کافی وسیع ہے، عیدین میں تین لاکھ کا مجمع ہوتا ہے اور جمعہ میں پچاس ہزار تک نمازی سما جاتے ہیں، ضروریات سے فارغ ہوکر مسجد پہنچے تو نمازیوں کا جم غفیر دیکھ کر ہمیں جمعہ کا شبہہ ہونے لگا، پتہ چلا کہ یہ تو روز کا معمول ہے، دوسری بات یہ بھی تعجب خیز تھی کہ اذان کے لیے کم از کم گھنٹہ بھر سے زائد کا وقت تھا اور ماشاء اللہ نماز کے لیے وقت سے قبل مسجد پہنچنے والے مصلیوں کی تعداد سینکڑوں سے اوپر تھی۔ مسجد کی دیواریں لکڑی کی تھیں جن کو نقش ونگار سے خوب آراستہ کیا گیا تھا۔ ایک اور تعجب خیز بات یہاں یہ دیکھنے کو ملی کہ مسجد میں آنے کے بعد کافی دیر تک لوگوں نے نمازیں (سنتیں یا نوافل) پڑھیں، پھر اقامت سے قبل امام صاحب نے جنازے کی نماز پڑھائی، پھر لوگوں نے نمازیں پڑھنی شروع کیں، ہم لوگ سمجھے کہ جماعت کھڑی ہونے والی ہے، مگر ہمارا خیال غلط ثابت ہوا کیوں کہ یہ نماز سنت تھی، فرض تو اس کے کافی دیر کے بعد شروع ہوئی۔ جنازے کی نماز

اقامت سے قبل پڑھنے کا یہاں رواج ہے، جس کا تذکرہ ہم پچھلے صفحات میں کرچکے ہیں۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد کھانے کے لیے ہمارے خصوصی رہبر شیخ داؤد نے مدعو کیا تھا جہاں ہم لوگوں کے مزاج ومذاق کی رعایت میں مچھلی تل بھن کر منتظر تھی، شیخ داؤد نے بھی خوب اندازہ لگالیا اور اس کے لیے اہتمام بھی خوب کیا۔

عصر کی نماز کے لیے ایک اور مسجد جانا ہوا جہاں ایک نوجوان کی امامت میں نماز ادا کی گئی، نماز کے بعد امام صاحب کے کمرے میں بلایا گیا جہاں اس نوجوان سے ملاقات ہوئی، پتہ چلا کہ یہ صالح نوجوان شیخ داؤد کی کرامت اور برکت ہیں، عمر کوئی ۲۴/ سال ہے مگر صلاح اور تقویٰ کے آثار ہویدا ہیں، گفتگو سے جذبِ اندروں کا بھی اندازہ ہوا، عربی بول لیتے ہیں، آج سے چھ سال قبل دین سے نابلد تھے، ان کے گاؤں میں جو یہاں سے ۳۰/ کلومیٹر دور ہے ۷/ گھر مسلمانوں کے تھے جو دین سے بالکل تہی دامن ہوگئے تھے، بس نام رہ گیا تھا، شیخ داؤد جماعت لے کر وہاں پہنچے، لوگ ملنے کے روادار بھی نہ تھے، مگر جہد مسلسل اور خلوص نے ان کے دلوں کو جیت لیا اور اللہ نے ان کے قلوب کو نرم کیا اور انھیں اپنی بے دینی پر افسوس ہوا۔ ان کی ایک بہن غیر مسلم کے نکاح میں ہیں، والد صاحب کا انتقال ہو چکا ہے، اب ماشاء اللہ یہ نوجوان مستقل محنت کر رہے ہیں، یہاں آکر اس مسجد میں تعلیم حاصل کی اور اس کے ذمے داروں کے منظورِ نظر ہو گئے، اللہ انھیں نظر بد سے بچائے اور ان سے خوب اپنے دین کی خدمت کا کام لے، ندوے آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہاں ایک صاحب بڑے خلوص کے ساتھ دہی اور پھل وغیرہ لاکر ہمارے سامنے رکھتے رہے، جن کے بارے میں معلوم ہوا کہ ان کا ذہنی توازن اگرچہ پوری طرح درست نہیں ہے مگر علماء سے بے انتہا محبت رکھتے ہیں۔

یہاں سے سیدھے شیخ داؤد کی دوکان پر پہنچے جہاں مختلف جڑی بوٹیاں اور دیگر قیمتی سامان فروخت کیے جاتے ہیں، ان کے شریک عیسیٰ بھائی کے یہاں عشائیے کا اہتمام تھا، مغرب بعد ان کے یہاں پہنچ کر کھانے سے فارغ ہوئے، کافی اہتمام کیا گیا تھا۔

عشاء کے بعد حسب وعدہ بھائی حسین ہماری قیام گاہ پر تشریف لائے اور بہت ہی خلوص اور اہتمام کے ساتھ تینوں کو حجامہ کے سنت عمل سے گزارا۔ یہاں پر اکثر حضرات حجامہ کا اہتمام کرتے ہیں اور اس میں مہارت بھی رکھتے ہیں۔

یکم اکتوبر

آج یکم اکتوبر ہے، ناشتے کے بعد مشورے کے مطابق ہمیں ایک جگہ جانا ہے جہاں پر ساتھی کافی تعداد میں جمع ہیں، آج باری راقم سطور کی تھی، اس لیے زندگی برائے بندگی، ایمان ویقین، اور اتباع سنت کے موضوع پر میں نے عربی میں گفتگو کی جس کا ترجمہ عبداللہ اخون نے بہت مؤثر انداز میں کیا، سامعین کی توجہ سے متکلم کا دل بھی پسیج رہا تھا، سامعین پر عجیب بے خودی اور گریہ طاری تھا، یہ دراصل ان ساتھیوں کا خلوص تھا اور عبداللہ اخون کی دردمند، مؤثر اور دل پذیر ترجمانی کا اثر تھا۔

یہاں کافی دیر گذارنے اور کچھ ستا لینے کے بعد ہمیں مولوی شعیب کے برادر اکبر کے یہاں پہنچنا تھا، مولوی شعیب بڑے مجاہد اور جفاکش داعی ہیں، ''الأحادیث المنتخبة'' کا ترجمہ انھیں کا کیا ہوا ہے، اس وقت جماعت میں نکلے ہیں، معلوم ہوا کہ عراقی النسل ہیں، ان کے تین بھائی ہیں، تینوں نے ترتیب رکھی ہے، سال میں چار ماہ اللہ کے راستے میں ہر بھائی لگاتا ہے، عوام میں بڑے مقبول ہیں، حکومت کی بھی کڑی نگاہ ہے، یوں تو ہر شخص پر حکومت کی نگاہ ہوتی ہے، مگر ان حضرات پر خصوصی نگاہ ہے، پھر بھی یہ حضرات کسی خطرے کی پروا کیے بغیر اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے قربانیاں دے رہے ہیں اور انھیں خطرہ اس لیے بھی نہیں کہ وہ جس دعوت کو عام کرتے ہیں وہ تو ایمان ویقین کی سیدھی سی دعوت ہے، اس میں کسی سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے اور حکومت چاہتی بھی یہی ہے کہ بس کوئی باغیانہ روش نہ اختیار کرے۔ اور یہ حضرات ظاہر ہے کہ اس طرح کی کوئی بات سوچ بھی نہیں سکتے۔

کھانے سے فراغت کے بعد وہیں کافی دیر تک آرام کیا گیا، شیننگ میں لنشیا کی طرح دوڑ بھاگ نہیں کرائی گئی، مناسب انداز میں ہم لوگوں کا استعمال کیا گیا، اور خود حکمت کا مظاہرہ یہ

حضرات اس میں بھی کرتے ہیں، اور اس کی ضرورت بھی ہے، ورنہ اجنبیت اور حلیے کے اختلاف کی وجہ سے ہر ایک کی نظر ہماری طرف اٹھتی اور ممکنہ طور پر کچھ سوالات ذہنوں میں پیدا ہو سکتے، اس کا موقع ہی کیوں فراہم کیا جائے، اس لیے یہ حضرات بہت سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کرتے، ہر جگہ ہم کو نہ لے جاتے، یہاں تک کہ نمازوں میں بھی تمام مسجدوں میں نہ لے جاتے، کبھی اپنی قیام گاہ ہی پر نماز پڑھنے کا اشارہ دیتے، کبھی ملاقاتیں ہوتیں تو سواری پر بیٹھ کر ہی گفتگو ہوتی، اس لیے کہ یہاں کے مخصوص ماحول میں کام سے زیادہ کام کی حفاظت کی ضرورت ہے، اور یہی تاکید ان حضرات کو اکابر کی طرف سے ہے۔

عصر بعد شیخ صالح کے یہاں جا کر پانچ ہی بجے عشائیہ سے فارغ ہو کر اسٹیشن کے لیے نکلنا تھا، کیوں کہ ہمیں آج ہی شی آن کے لیے شام کی گاڑی پکڑنی تھی۔ یہ وہی شیخ صالح ہیں جن کے یہاں کل صبح حاضری ہوئی تھی، یہاں پہنچے اور عشائیے سے فارغ ہوئے، تین نوجوانوں سے ملاقات ہوئی جو ابھی دعوتی محنت سے جڑے ہیں اور تین روز جماعت میں لگا کر آئے ہیں، کچھ ترغیبی گفتگو ہوئی اور فقہی مسالک کے بارے میں بھی تبادلۂ خیال ہوا، بڑی محبت سے پیش آئے اور تحفے کی شکل میں محبت کی سوغات بھی پیش کی۔ شیننگ میں دوسرے شہروں کی بہ نسبت ٹریفک کا ہجوم زیادہ ہوتا ہے اس لیے جلد ہی اسٹیشن کے لیے نکلنا طے پایا اور نماز مغرب پڑھ کر روانہ ہو گئے۔

جوں ہی اسٹیشن پہنچے ہمارے اوسان خطا ہو گئے، اس لیے کہ اس بھیڑ میں سامان کے ساتھ اندر پہنچنا کسی معجزے سے کم نہیں تھا اور پھر تماشا یہ کہ کسی رخصت کرنے والے کے لیے پلیٹ فارم میں بار پانا بھی ناممکن تھا، ہمارے ہندوستان کی طرح نہیں کہ مسافر ایک اور اس کو رخصت کرنے کے لیے پچاس لوگ، گویا اسٹیشن کیا ایک تماشا گاہ ہے! یہاں آبادی پر کنٹرول کے باوجود یہ حال تھا کہ اسٹیشن پر صحیح معنوں میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی؛ جملہ معترضہ کے طور پر یہ عرض کردوں کہ چین میں کسی کے دو سے زائد بچے نہ ہونے کے برابر ہیں، دو سے زائد بچوں پر پابندی ہے، ورنہ لاکھوں یوآن جرمانہ ادا کر کے حکومت سے مراعات حاصل کرنی پڑتی ہیں۔

اللہ کا فضل ہوا کہ رخصت کرنے کے لیے جو حضرات آئے تھے ان کو اسٹیشن میں
باریابی کا پروانہ مل گیا اور وہ اندر تک چلے آئے، اب بھی راستہ آسان نہ تھا کیوں کہ اندر بھی
ہجوم بے پناہ تھا، کسی طرح قلی حضرات سے بات ہوئی اور انھوں نے پلک جھپکتے میں چور
دروازے سے اندر تک پہنچا دیا، ٹرین سامنے کھڑی تھی، پلیٹ فارم کی صفائی ستھرائی، اور نظم
ونسق دیکھ کر واقعی بے انتہا خوشی ہوئی۔

اب ٹرین پر چڑھ رہے ہیں، ایک ایک کر کے سامان اوپر لے جایا جا رہا ہے، سامان کسی
سے اٹھ نہیں رہا ہے، یہ منظر بھی ان آنکھوں نے دیکھا کہ ٹی ٹی خود آگے بڑھتے ہیں اور
مسافروں کا سامان اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر رکھتے ہیں، یہ دیکھ کر چینیوں کی قدر آئی اور اندازہ
ہوا کہ کوئی ملک یوں ہی ترقی نہیں کرتا، بلکہ محنت، جفاکشی، عدمِ انانیت اور خدمت ان سب
عناصر کا بڑا دخل قوموں کی ترقی میں ہوتا ہے۔ یہ بات ہمارے ملک کے پس منظر میں ہمیں
بڑی عجیب وغریب لگتی ہے کہ چین میں ٹی ٹی مسافروں کی خدمت کرتے ہیں، آتے ہی سب
سے پہلے مسکرا دیتے ہیں، ہر کمپارٹمنٹ میں خود آ کر جھاڑو لگا دیتے ہیں اور جو بھی ضروری کام
ہوتا ہے اسے کر گذرنے میں انھیں کوئی عار نہیں ہوتا، اس لیے ٹرینوں کے اندر وباہر کی صفائی
ستھرائی قابل دید ہوتی ہے، اس کے برعکس ہمارے یہاں کا جو حال ہے وہ جگ ظاہر ہے۔

مولوی عادل اور شیخ داؤد کو الوداع کہہ کر اب ہمیں یہاں سے اگلے پڑاؤ پر اترنا تھا، دونوں
کو تشکر کے جذبات سے لبریز دلوں کے ساتھ رخصت کیا، اللہ کے ان بندوں نے بھی کمال
کر دیا، آٹھ دنوں تک مستقل ہمارا ساتھ دیا، نہ سفر کی کوئی کلفت محسوس ہونے دی نہ اجنبیت کا
احساس ہونے دیا۔ اور غریب الدیار مسافروں کی جہاں زبان جاننے والا کوئی نہیں تھا وہاں ان
کی ہر طرح کی راحت کی فکر کی۔ اور آج ان کو رخصت کرتے وقت بھی جدائی پر ان کی آنکھیں
اشک بار تھیں اور دل سوگوار، اور خود ہمیں بھی فرقت کا احساس ہو رہا تھا، طبیعت ان حضرات سے
کافی مانوس ہوگئی تھی، اور جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ ایسے اچھے لوگوں کا ساتھ کبھی نہ چھوٹے۔
وقت مقررہ پر ٹرین چھوٹی، اور ہم لوگ تھوڑی دیر گفتگو کے بعد نیند کی آغوش میں چلے

گئے، صبح ۱۰/ بجے کے قریب شی آن پہنچنا تھا، سپیدۂ صبح جب نمودار ہوا تو ٹرین کو کوہستانوں
سے گذرتے سرنگوں میں گھستے نکلتے دیکھا، موسم بھی سہانا تھا اور منظر بھی دل کش، طویل
القامت پہاڑ قدرتی حسن سے مالا مال تھے۔ مختلف پہاڑوں کا چکر کاٹتے مختلف وادیوں
سے گذرتے ہوئے صبح ۱۰/ بجے کے قریب گاڑی شی آن اسٹیشن پر رکی۔

شی آن (Xi'an) میں ۲/ دن

شی آن (Xi'an) صوبہ شانزی (Shanxi) کا اہم شہر ہے، قدیم اور سیاحتی اعتبار
سے اہمیت کا حامل ہے۔ ملک وبیرون ملک سے سیاح یہاں کا رخ کرتے ہیں، تاریخی اعتبار
سے بھی اس کی بڑی اہمیت رہی ہے، کہتے ہیں کہ ۱۳/ بادشاہوں کا یہ مرکز رہا ہے۔ شی آن کی
کل آبادی ایک کروڑ بتائی جاتی ہے جس میں مسلم تناسب ایک فیصد ہے یعنی ۸۰/ ہزار سے
لے کر ایک لاکھ کی تعداد مسلمانوں کی ہے اور وہ بھی زیادہ تر ایک ہی علاقے میں مقیم ہیں۔

شی آن (Xi'an) کی سب سے نمایاں خصوصیت

شی آن کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچانے میں یہاں کی قدیم مسجدوں کا اہم کردار رہا ہے،
آگے چل کر ان شاء اللہ ان کا ذکر کیا جائے گا۔ مساجد کی تعلیمی تحریک بھی یہیں کی پیداوار ہے،
۴۰۰/ سال قبل یہیں سے نکل کر یہ تحریک پورے چین میں عام ہوئی اور لادینیت کے طوفانوں
میں بھی لوگوں سے دین کا تعلق قائم رکھنے میں مدد ومعاون ثابت ہوئی۔ جس طرح ہمارے
یہاں درس نظامی کو گذشتہ صدی میں بالخصوص ۱۸۵۷ء کے بعد مقبولیت حاصل ہوئی اسی طرح
چین میں ’’چنگ تھانگ جاوای‘‘ نامی اس تعلیمی تحریک کو قبول عام حاصل ہوا، اس نظام تعلیم کے
پہلے تربیت یافتہ عالم کا نام ’’Hudeng Zhou‘‘ بتایا جاتا ہے۔

شیخ داؤد نے یہاں بھی نظم کر دیا تھا، ایک دعوتی ساتھی عیسیٰ بھائی کو ہماری رہنمائی کا مکلّف
بنا دیا تھا، بھائی عیسیٰ نے پاکستان میں وقت لگایا ہے، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ یوں وقت لگانے
کو تو سب لگا لیتے ہیں مگر اردو سے انھوں نے خاصی رسم وراہ پیدا کر لی ہے، اردو بیانات کا بھی

خاصا ذخیرہ اپنے پاس رکھتے ہیں، سادہ لوح طبیعت پائی ہے، دعوت کے لیے فکر مند بھی رہتے ہیں، ہمارے استقبال میں اسٹیشن کے باہر موجود تھے، ہم کو لے کر چلے اور اپنے ایک ماموں کے یہاں جو سفر حج پر تھے ہمارا قیام کرایا، پہنچتے ہی ناشتے وغیرہ سے فارغ کیا، ظہر کے بعد ذمے داروں سے ملاقات ہوئی اور کچھ مشورہ ہوا، دعوت کی نسبت سے کچھ بات ہوئی، معلوم ہوا کہ یہاں ۴/ ماہ لگائے ہوئے ساتھیوں کی تعداد تقریباً ۴۰/ ہے، کل ۲۱/ مسجدیں ہیں، جن میں ۸/ مسجدوں میں دعوت کے ۵/ اعمال زندہ ہیں، مسجدوں کے علاوہ ۵/ استقبال کے مراکز ہیں، ۱۵/ سال قبل یہاں کام شروع ہوا تھا۔ ایک پاکستانی طالب علم اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مقصد سے یہاں آیا اور اپنے ساتھ دعوت کا جذبہ بھی لے آیا، اس نوجوان کا نام عبدالمنان تھا؛ اس نے یہاں دعوت کا تعارف کرایا اور لوگوں کو محنت سے جوڑا، ۱۷/ سال قبل یہاں سے پہلی جماعت نکلی۔ بھوپال سے یہاں والوں کو کافی تعلق ہے، ہندوستان میں جن حضرات کا وقت لگا ہے ان کو بھوپال ہی میں کام کرنے کا موقع ملا ہے؛ اس کا ان لوگوں نے تذکرہ کیا، اسی طرح ممبئی کے ایک تبلیغی ذمے دار مشتاق صاحب کا بہت نام لیا جن کی اس علاقے میں خصوصی خدمات رہی ہیں۔

یوں تو دنیا کے بے شمار ملکوں میں بے شمار طلباء تعلیم حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں، اور فارغ ہو کر چلے بھی آتے ہیں، تعلیم ہی حاصل کرنے کے مقصد سے ایک طالب علم یہاں کا بھی رخ کرتا ہے، مگر اس کے پہلو میں ایک دھڑکتا دل اور مضطرب روح ہے، جو اس کو چین لینے نہیں دیتی اور وہ نتیجے کی پروا کیے بغیر اللہ کے بندوں کو اللہ سے جوڑنے کی اپنی سی کوشش کرڈالتا ہے، دین کے فروغ کے لیے اور کلمے کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرتا ہے، اور اس کی یہ ادا درگاہِ الٰہی میں شرف قبول سے باریاب ہوتی ہے، اور ہنگامِ روزگار سے نکل کر بے چین روحیں حرم کی فضاؤں میں آ کر سکون پاتی ہیں اور اسباب کے بجائے مسبب الاسباب سے بندوں کا تعلق جڑ جاتا ہے؛ وہ تو تعلیم حاصل کر کے چلا بھی گیا، بہت ممکن ہے اسے پتہ بھی نہ ہو کہ اپنے پیچھے وہ بے حساب اجر کا خزینہ چھوڑ گیا ہے اور اپنے لیے جینے والے انسانوں کو امت کے لیے جینے کا قرینہ دے گیا ہے۔ اور ایک پوری امت کو زندگی گذارنے کا سلیقہ سکھا گیا ہے۔

ہماری بھی ملاقات پاکستان کے کئی نوجوانوں سے ہوئی جو تعلیم بھی حاصل کر رہے ہیں اور ماشاء اللہ دعوت سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس وقت تقریباً دو ہزار کے قریب پاکستانی طلبہ یہاں صرف شی آن میں زیر تعلیم ہیں، پاکستانی حکومت بھی انھیں سالانہ کئی سو ڈالر وظیفہ دیتی ہے اور چوں کہ چین کے پاکستان سے دیرینہ مراسم ہیں اس لیے چینی حکومت کی بھی ان طلباء پر نظر کرم ہے۔

شی آن کی تاریخی جامع مسجد

عصر کی نماز کے لیے ہم لوگوں نے جامع مسجد کا رخ کیا، یہ چین کی انتہائی قدیم مسجدوں میں ہے، اور عجیب بات یہ ہے کہ اس سے قدیم مسجد بھی یہیں شی آن میں موجود ہے جہاں اگلے دن فجر کی نماز پڑھنی تھی۔

جامع مسجد کا سن تعمیر یہاں آویزاں کتبے پر ۷۴۰ء مکتوب ہے، یعنی اس کی تاسیس دوسری صدی ہجری کے دوسرے دہے کی ہے، مزید تفصیل تاریخ کے حافظے نے یاد نہیں رکھی۔ بعض اقوال کے مطابق اس کا سن تاسیس ۴۰ھ بیان کیا جاتا ہے۔ اور یہ کوئی مستبعد نہیں ہے؛ اس لیے کہ اسلام کی دعوت بالکل ابتدا ہی میں چین کی وادیوں میں پہنچ چکی تھی، مؤرخین کے بقول خلیفۂ راشد حضرت عثمانؓ بن عفان نے ۲۹ھ مطابق ۶۵۱ء میں پہلا دعوتی وفد چین کی طرف بھیجا، اور عملی طور پر مسلمان تاجروں کے ذریعے چین میں دعوت اسلامی کو استحکام ملا، اور قتیبہ بن مسلم کی قیادت میں ۶۹ھ (۷۱۶ء) میں اسلامی فتوحات کا لشکر چین کی سرحدوں پر پہنچا، جنگ نہ ہوئی اس لیے کہ شہنشاہِ چین نے جزیہ کی ادائیگی پر اتفاق کر لیا، اور اس کے بعد کی مختلف صدیوں میں وہاں اسلام پھیلتا گیا اور مسلمان اپنے اخلاق اور کردار کی بدولت کئی صدیوں تک شاہانِ چین کی نظر کرم کے مستحق بنے رہے، اور ان شاہوں نے اپنی مسلم رعایا کا بہت خیال رکھا، ان کو خوب مراعاتیں دیں بلکہ آگے بڑھ کر ان کے لیے خود اپنے صرفے سے عالی شان مسجدیں تعمیر کیں۔ انھیں مسجدوں میں ایک یہ مسجد ہے، جس میں آج ہم حاضر ہوئے ہیں۔

اس مسجد کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کی دیواروں پر لکڑی میں پورا قرآن پاک

کندہ ہے، ایک پارہ ایک تختی پر تحریر کیا گیا ہے، وہ بھی لکڑی کو تراش کر، اس طرح تیس بڑی بڑی تختیوں پر پورا قرآن مجید کندہ کیا گیا ہے اور عجیب مینا کاری کی گئی ہے، یہ چیز دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس نقش ونگار کی تاریخ بھی کوئی ہزار بارہ سو سال پرانی بتائی جاتی ہے۔

مسجد کے مسقّف حصے کو چھوڑ کر اس کا صحن کافی وسیع ہے، رقبہ کئی ہزار مربع میٹر پر محیط ہے، آس پاس میں ائمہ کے کمرے اور شاید مکاتب بھی ہیں۔

جامع مسجد میں ایک عجیب بات یہ دیکھنے کو ملی کہ امام صاحب جبہ ودستار کے ساتھ ایک جماعت کے جھرمٹ میں تشریف لائے، اور اقامت شروع ہوتے ہی رکعت باندھ لی، اقامت اس کے بعد تک جاری رہی۔ نماز کے بعد بلند آواز میں اذکار واوراد پڑھے گئے، جو پڑھا جارہا تھا ہزار کوشش کے بعد بھی ہم لوگ اس کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

مسجد کے پہلو ہی میں ایک دوکان سے چینی آرٹ کے کچھ نمونے ہم نے خریدے اور جس ہوٹل میں ساتھی کھانے کے لیے انتظار کر رہے تھے وہیں چل کر کھانے سے فارغ ہوئے، یہ ایک تبلیغی ساتھی کا ہوٹل تھا اور یہاں پر بھی تبلیغی ساتھیوں کے جدید سہولیات سے آراستہ بہت سارے ہوٹل ہیں، کھانے سے فارغ ہوکر پیدل چلتے ہوئے ایک اور مسجد پہنچے جہاں امام صاحب سے مغرب بعد ملاقات کرنی تھی۔

ایک غیر مقلد عالم سے خوش گوار ملاقات

یہ سلفی مسجد ہے، مگر مقتدیوں میں سلفی بھی ہیں حنفی بھی، یہ بات ہمیں برصغیر کے پس منظر میں چاہے عجیب وغریب لگے مگر یہاں من وتو کا فرق نہیں ہے، اور نہ ہی کوئی تعصب کا برتاؤ ہے، اس میں بڑا دخل اس کے نوجوان امام مولوی اسماعیل بن نوح لیو اور ان کے والد صاحب کا ہے، امام صاحب نوجوان ہیں، عمر کوئی تیس سال کے قریب ہے، سلیم الطبع ہیں، صحیح الفکر ہیں، معتدل المزاج ہیں، متوازن شخصیت کے حامل ہیں، سات سال قبل (۱۹۹۹ تا۲۰۰۶ء) جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی کلیۃ القرآن سے فراغت حاصل کی، اور اب یہاں دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ قراءات عشرہ پر بھی عبور ہے۔ اس سے قبل والد

صاحب نے بیس سال تک امامت کی خدمت انجام دی۔

امام صاحب سے کافی توقعات ہیں، عربی اچھی بولتے ہیں، تبلیغ سے محبت رکھتے ہیں، والد صاحب نے چلہ لگایا ہے، امام صاحب نے خود وقت تو نہیں لگایا ہے مگر تبلیغی کوششوں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ہم سے ملاقات پر کہنے لگے کہ تبلیغ کا کوئی بدل نہیں، عمل میں تبلیغ والوں کا کوئی ثانی نہیں، بقیہ لوگوں کے پاس نظریات اور افکار ہیں، عمل تو انھیں کے پاس ہے۔ بڑے وسیع القلب ہیں، ہم نے ایسا کشادہ دل اور خندہ جبیں آدمی کم از کم اپنی زندگی میں بہت کم دیکھا ہے، کم عمری ہی میں اللہ نے ہر دلعزیزی اور کام کا سلیقہ عطا فرمایا ہے، بڑی حکمت برتتے ہیں، فروعی اختلافات میں درگذر اور تسامح کا ظرف رکھتے ہیں؛ خود اس کی ضرورت پر بھی زور دیا اور اپنا طرز عمل بیان کیا کہ ہم خواہ مخواہ کے لیے چھوٹے چھوٹے مسائل میں الجھتے نہیں بالخصوص جہاں شریعت نے اجازت دی ہے وہاں اڑیل رویہ سے بسا اوقات دعوت کے کاز کو نقصان پہنچتا ہے، اس لیے ہم رفع یدین تو کر لیتے ہیں مگر یہاں ائمہ کے لیے جو مخصوص حلیہ اختیار کیا جاتا ہے اس سے ہم گریز نہیں کرتے، کیوں کہ اس سے خواہ مخواہ کے لیے لوگوں کو تشویش ہو سکتی ہے۔

رفع یدین میں بھی ہم نے انھیں دیکھا، کلمۂ شہادت کے وقت انگلی کو حرکت دیتے ہوئے اور سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے بھی دیکھا ان کے یہاں وہ غلو نہیں تھا جو ہمارے یہاں برصغیر میں پایا جاتا ہے، ہمارے یہاں تو بعض حضرات کے سینے حلق اور ٹھوڑیوں تک ہوتے ہیں، چین کے ان وسیع القلب اور فراخ دل حضرات کے یہاں ایسی شدت کا دور دور تک گذر نہیں، یہی بات ہے کہ ہر کوئی انھیں چاہتا ہے اور وہ ہر ایک کی آنکھوں کا تارا ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے بہت بہت دین کا کام لے لے، آمین۔

مولوی اسماعیل سے کافی دیر تک گفتگو ہوتی رہی، چین کی دینی صورت حال پر تبادلۂ خیال ہوا، دردمندی کا اظہار کرتے رہے بالخصوص سرکاری اسکولوں کے حال پر اور نئی نسل کے عقیدے اور ایمان کی بقا کے متعلق بڑے فکر مند رہے، مسجدوں کے علاوہ کہیں پر بھی دینی کام کی اجازت نہ ہونے پر اپنی بے چینی کا اظہار کیا، اور ہم نے آگے بڑھ کر انھیں میدان

سنبھال لینے کی دعوت دی۔

عشاء کی اذان تک وہیں بیٹھے رہے، ان کی اس گفتگو نے دل کو ان کی محبت کا اسیر بنادیا اور دینی مستقبل کے تئیں بہتر امیدوں اور تمناؤں نے دل میں چٹکیاں لیں۔ عشاء کی نماز وہیں پڑھ کر اپنی قیام گاہ واپس ہوئے۔

واپس ہوتے ہوئے ایک اور ساتھی سے ملاقات طے پائی جو کئی ساتھیوں کے دعوت سے جڑنے کا سبب بنا مگر وہ خود ابھی دعوت سے دور ہو گیا ہے۔ ان کی ملاقات کے ارادے سے نکلے تو راستے میں وہ بھیڑ ملی کہ خدا کی پناہ، ۱۰/ منٹ کے راستے نے گھنٹے بھر سے زیادہ کا وقت لے لیا، معلوم ہوا کہ ان دنوں چوں کہ قومی تہوار چل رہا ہے اس لیے سارے لوگ کھانے پینے کے لیے اسی علاقے کا رخ کرتے ہیں، کیوں کہ یہ محلّہ اپنے لذیذ پکوانوں کی وجہ سے کافی شہرت رکھتا ہے اور اچھی بات یہ ہے کہ اکثریت مسلم ہوٹلوں کی ہے۔

اس ساتھی سے ملاقات کے لیے ان کے ہوٹل جانا ہوا، بڑے اخلاق سے پیش آئے، ناؤنوش کا بھی نظم کیا، دیر تک ترغیبی گفتگو رہی، مگر اندازہ ہوا کہ ان کے ذہن میں خلجان موجود ہے جو لگتا ہے کسی کی طرف سے بھر دیا گیا ہے اور وہ پروپیگنڈے سے متاثر ہو گئے ہیں۔ ان کی گفتگو سے آنے والے وقت میں دین کا نام لے کر گھسنے والے کچھ فتنوں کی بھنک ہم لوگوں کو محسوس ہوئی جس پر ابھی سے توجہ کی ضرورت ہے، ورنہ معاشرے کا یہ ایک ناسور ثابت ہو سکتا ہے اور جس طرح برصغیر کا معاشرہ آئے دن نت نئے فتنوں کے پھیر میں الجھتا جا رہا ہے اسی طرح چین کا پرامن ماحول بھی اس کی زد میں آ سکتا ہے۔

شی آن کی ایک اور قدیم ترین مسجد

دوسرے دن ۳/ اکتوبر علی الصباح فجر کی نماز ہی کے لیے یہاں کی ایک اور قدیم مسجد ''تاشو شی شانگ'' (Daxue Xiang) جانا تھا، اس مسجد کی معلوم تاریخ سنہ عیسوی ۷۰۵/ دیواروں پر آویزاں ہے جس کا مطلب ۸۰ھ کے آس پاس کی تعمیر ہے، اس کی تجدید کو بھی کوئی ۶۰۰/۷۰۰ سال سے زائد گذر چکے ہیں، یہ مسجد بھی قدیم چینی فن کا ایک شاہکار ہے، عجیب بات یہ ہے کہ

اس کے معمار بھی چینی بادشاہ بتائے جاتے ہیں، جو اگر چہ کہ غیر مسلم تھے مگر انھیں یہاں کے مسلمانوں کے اخلاق نے اپنا گرویدہ بنا دیا تھا اور یہ خود ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس دور میں دنیا جہاں کے مسلمان مظلومیت کے دور سے گذرے اور خود تاتاریوں کی تاخت وتاراج سے دنیا لرزہ براندام رہی' ایک چین کا ملک تھا جہاں مسلمان اپنے حسن اخلاق کی بدولت حکمرانوں کی آنکھوں کا تارا تھے، اور انھیں ہر قسم کا امن وامان اور چین وسکون میسر تھا، پھر گردش لیل ونہار نے وہ دن بھی دکھادیے کہ چینی مسلمانوں کو بھی یورش اور یلغار کے تاریک ترین دور سے گذرنا پڑا؛ یہ اخیر کی دو تین صدیوں کی بات ہے، مؤرخین اور محققین کے لیے یہ ایک نقطۂ تحقیق ہے۔

"TANG" دورِ حکومت کے شہنشاہ ''ZHONGZONG'' کو اس مسجد کا معمار بتایا جاتا ہے، مسجد کا رقبہ ۷۰۰۰/ مربع میٹر پر محیط ہے، دائیں بائیں جانب کئی کمروں اور مسجد کے کشادہ ہال کے علاوہ وسیع وعریض صحن اور بلند دروازہ خصوصیت کے ساتھ سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے۔

نماز سے فارغ ہو کر امام صاحب سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو رہبر نے اس کا انتظام کر دیا، اور مسجد سے متصل ہی امام صاحب کے کمرے میں جانا ہوا، امام صاحب نوجوان نظر آئے، ویسے یہاں ہر کوئی جوان ہی نظر آتا ہے، عمر کا کوئی صحیح اندازہ چینیوں کو دیکھ کر مشکل سے ہی کیا جا سکتا ہے، نام موسیٰ ہے، جامعہ ملک سعود ریاض سے فارغ ہیں، کافی خوش ہوئے، دیر تک گفتگو رہی، شی آن کی تاریخ اور یہاں کی مسجدوں سے متعلق ہم نے کئی باتیں جاننی چاہیں، بہت کھل کر ملے، ان کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ مسجد پہلے ایک بہت بڑا دینی مرکز تھی مگر اب آلامِ روزگار نے اس کو ایک مختصر سے مدرسے میں محدود کر دیا ہے جہاں صرف تین طلبہ زیر تعلیم ہیں، اور اقتصادی فکر نے ہر ایک کو دینی مدرسوں سے غافل کر دیا ہے، اسی لیے یہاں علماء کی سخت کمی ہے، یہ باتیں سن کر بڑا دکھ ہوا۔

امام صاحب نے یہ بات بھی بتائی کہ شی آن ہی وہ پہلا شہر ہے جس کو مسلمانوں نے رونق بخشی، حالاں کہ جنوبی چین میں گوانزو یا دیگر شہروں کے بارے میں تاریخ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں سب سے پہلے مسلمانوں کے قدم پڑے، (خود گوانزو میں جامع أبی وقاص کے

نام سے ایک قدیم مسجد بھی ہے اوران ابووقاص کا مقبرہ بھی ہے، اکثر لوگوں کو اُبی وقاص کا نام سن
کر غلط فہمی ہوتی ہے اور وہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص سمجھ بیٹھتے ہیں، جب کہ حضرت سعد بن ابی
وقاصؓ اس سے ہرگز مراد نہیں ہوسکتے، کیوں کہ ان کی وفات' مؤرخین کے بقول مدینے سے
سات میل کے فاصلہ پر مقامِ ''عقیق'' میں ہوئی، یہ ابی وقاص کوئی اور معلوم ہوتے ہیں' تاریخ کے
صفحات میں تفصیلات نہ ہونے کی وجہ سے جن کے صحابی ہونے یا نہ ہونے کے متعلق قطعیت
کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جاسکتی) مگر غالباً امام صاحب کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ شی آن وہ پہلا
شہر ہے جسے مسلمانوں نے رونق بخشی، ان کے بقول عہد عثمانی میں اس کی تعمیر ہوئی۔

مِنگ شہنشاہی (Ming Dynasty) کے پہلے مسلم سفیر چنگ خا
(ZHENGHE) تھے جنھیں مسلم ممالک کے لیے سفیر بنایا گیا تھا، انھوں نے عرب
ممالک کا بحری سفر کیا تو ان کو عربی کے عالم کی شدید ضرورت محسوس ہوئی، اس لیے انھوں نے
اسی مسجد کے امام صاحب حسن سے رابطہ کیا اور ۱۴۱۳ء میں انھیں اپنے ساتھ (اپنی چوتھی بحری
مہم کے) سفر پر لے گئے، سفر بحری تھا، سمندر کے بیچ میں کشتی طوفانوں میں گھر گئی، ایسے میں
امام صاحب کی کرامت ظاہر ہوئی، بپھری ہوئی موجوں کو دیکھ کر حضرت پر سکینت طاری تھی،
خوف وہراس نام کو نہ تھا، اِدھر انھوں نے دعا کے لیے دربار الٰہی میں ہاتھ اٹھائے اور اُدھر
ناسوت کے پردے چاک کرتی ہوئی دعا آسمانوں پر پہنچی اور قبولیت سے باریاب ہوئی۔

حضرت کی اس کرامت کا تذکرہ سفیر نے بادشاہ سے کیا تو بادشاہ بہت خوش ہوا اور ان
سے کہا کہ آپ مانگیے جو مانگنا ہو، سب کچھ دے دیا جائے گا۔ اللہ والوں کی شان استغنائی بھی
عجیب ہوتی ہے، فقیری میں وہ شاہی کرتے ہیں، درویشی ان کی پادشاہی ہوتی ہے، انھوں نے
کسی چیز کو قبول کرنے سے انکار کردیا، جب بہت اصرار ہوا تو اس مسجد کی توسیع کی خواہش
ظاہر کی، جس پر بادشاہ نے یہ وسیع وعریض جگہ مسجد کے نام کردی اور مسجد کی توسیع کی۔

امام صاحب سے اس تفصیلی گفتگو کے بعد اپنی قیام گاہ واپس لوٹے، دعوت کے کچھ
ذمے دار ساتھی جمع ہوگئے تھے، اس لیے تھوڑی دیر مولانا فیصل صاحب نے گفتگو کی۔ یہاں

کے ایک قابل ذکر ساتھی احسان سنگاپوری ہیں، جنھوں نے یہاں چین میں شادی کرکے
یہیں کی سکونت اختیار کرلی ہے، تجارت کرتے ہیں، بڑے متواضع ہیں، کافی گھل مل گئے،
ان سے انگریزی میں گفتگو ہوئی، اور چین میں تنہا یہی وہ ساتھی ہیں جن کے ساتھ انگریزی
میں گفتگو ہوئی، باقی کہیں بھی انگریزی نے ہم سے وفا نہ کی۔

تھوڑی دیر آرام کرکے رخت سفر باندھا گیا، کیوں کہ آج شام ہی کو یہاں سے نکلنا
تھا، کل آتے ہی شی آن سے ہنزو کا ٹکٹ خرید لیا گیا تھا، سیاحوں کے بے پناہ ہجوم کی وجہ سے
کوئی اور راستہ نہ تھا، خواہش کے باوجود بھی مزید ایک روز قیام کرنا ہمارے لیے ممکن نہ تھا،
اگلے روز عید الاضحیٰ تھی، مگر مجبوری کی بنا پر عید کی خوشیوں کو ٹرین کی نذر کردینے کا فیصلہ ہوا۔

جمعہ کی تیاری کی گئی، اور اس کے لیے نکلے، راستے میں شی آن کے مشہور مقامات (قلعہ
کا دروازہ، بُرج وغیرہ) کا دور سے مشاہدہ کرتے ہوئے ایک جگہ جانا ہوا، بتایا گیا کہ یہیں
جمعہ کی نماز پڑھنی ہے، یہ یہاں کا ایک مشہور شاپنگ سینٹر ہے جہاں حلال وحرام کی تمیز کے
ساتھ اشیاء کی فروخت کا اہتمام ہے، ایک فکر مند مسلمان اس کے مالک ہیں، اس کے عقب
میں دوسری منزل پر ایک خوب صورت مسجد ہے، جہاں پہنچ کر ہمیں جمعہ سے فارغ ہونا تھا،
وقت سے پہلے ہی ہم لوگ پہنچ گئے اور اولین صفوں میں جگہ پائی، معلوم ہوا کہ یہ سلفی مسجد ہے،
مگر یہاں بھی معروف شدت کا ادنیٰ اثر بھی دکھائی نہ دیا، نمازیوں میں مختلف مسالک کے
لوگ شامل تھے، بلکہ ایک کو تو ہم نے سجدوں اور جلسوں میں بھی رفع یدین کرتے ہوئے
دیکھا، جو شکل وصورت سے مصر یا کسی عربی ملک کے معلوم ہو رہے تھے، کتابوں میں یہ مسلک
تو پڑھا تھا مگر آج پہلی دفعہ اس پر عمل کرنے والے کو دیکھا۔ یہاں ہمارے برصغیر کے شدت
پسند سلفی بھائیوں کے برخلاف ہم نے جمعہ سے قبل سنت نمازوں کا اہتمام بھی دیکھا، دونوں
اذانیں بھی بلند ترین گرج دار آواز کے ساتھ بلند ہوئیں، البتہ خطبہ چینی زبان میں ہوا جس کا
مرکزی موضوع ایک آیت کی تفسیر تھا؛ جس میں اعراب کی کچھ غلطیاں نظر آئیں۔

جمعہ کے بعد مسجد کے متولی اور کئی منزلوں پر مشتمل اس وسیع وعریض شاپنگ سینٹر کے مالک

سے بات ہوئی، جو خود غیر مقلد تھے، مگر ان کی باتوں سے بھی کہیں شدت پسندی کی بو نہ آئی، بلکہ
اس کے برعکس انھیں اتحاد کا داعی اور احیائے اسلام کے لیے ہونے والی جملہ کوششوں کا قدر دان
پایا، اخلاق اور کردار کی ضرورت و اہمیت اور بالخصوص ان ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں
ہیں اس کی اہمیت کے دو چند ہونے پر انھوں نے کافی زور دیا، ان کے دل کی دردمندی ان کی
باتوں سے ہویدا تھی، وہ ہم سے اپنے دل کی بات کہے جا رہے تھے، دعوت و تبلیغ کی جد و جہد کو
خوب سراہتے رہے، کہنے لگے کہ عمل تو مسلمان کی پہچان ہے اور یہ تبلیغ والوں کی نمایاں خصوصیت
ہے کہ ان کے یہاں نظریات سے زیادہ عمل پر زور ہے، اور حسن اخلاق بھی سب سے زیادہ ان
میں پایا جاتا ہے، اور یہی وہ جوہر ہے جس کے ذریعے دوسروں کا دل جیتا جا سکتا ہے۔

بات تو انھوں نے چینی میں کی مگر ان کے صاحب زادے (جنھوں نے کسی عربی ملک
میں بھی تعلیم حاصل کی ہے اور اب یہاں انجینئرنگ کر رہے ہیں) نے عربی میں اس کا
ترجمہ کیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر اسٹیشن پہنچنے کی تیاری کی گئی، عصر کے بعد کسی ہوٹل میں پہنچ
کر ناشتہ کیا اور جلد ہی اسٹیشن کے لیے روانہ ہو گئے۔

اسٹیشن پر کافی بھیڑ یہاں بھی موجود تھی، وقت سے بہت پہلے پہنچ چکے تھے، اس لیے
پڑھنے لکھنے میں مشغول ہو گئے، اور جب بورڈنگ کا اعلان ہوا تو ٹرین پر سوار ہوئے، اور
جلد ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گئے۔

اک عید ایسی بھی...

صبح جب نیند سے بیدار ہوئے تو معلوم ہوا کہ آج عید بھی ہے، مگر یہ عید تو پردیسی ہے،
پردیسیوں کی عید جو ٹھہری۔ چلیے اک عید ایسی بھی کہ دیارِ غیر.. جہاں کوئی جاننے والا نہیں..
پردیس، جہاں کوئی پہچاننے والا نہیں.. زبان جاننے والا بھی نہیں... مگر ہاں، انسانیت کی زبان
ایک ہے، جسے ہر انسان جانتا ہے.. چناں چہ یہاں بھی انسان بستے ہیں... انسانوں کی بہت
ساری خوبیاں ابھی یہاں زندہ ہیں... یہاں سب سے بڑی بات یہ کہ تعصب کا طوفانِ بلاخیز
نہیں.. جس کی تباہ کاریاں اظہر من الشمس.. اور جس نے خاک اور خون کے کتنے ہی دریا

بہا دیے اور سانس لیتی زندہ بستیوں کو پل دو پل میں شہر خموشاں میں تبدیل کر دیا... یہاں ابھی
انسانیت زندہ ہے.. ابھی انسان زندہ ہے.. اک ایسے دیس میں ہم نے بھی عید منائی.. ٹرین کی
بوگیوں پر.. تو اندازہ ہوا کہ وفا کی راہ میں جن کے گھر بار لٹ گئے.. مکان اجڑ گئے.. سہاگ
چھن گئے.. خواب بکھر گئے.. کیسی گزرتی ہوں گی ان کی راتیں! اور کیسے گزرتے ہوں گے ان
کے دن... تڑپتے.. بلکتے.. کروٹیں بدلتے.. آہیں بھرتے.. بلبلاتے.. کلبلاتے..

ہمارا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا سب کچھ ٹرین کی نذر ہو گیا.. کیوں کہ دوستوں نے منع کر رکھا تھا..
آج ہمیں بھوک ستا رہی ہے.. مگر ہمارے بہت سارے بھائیوں کو وہ چیتھڑے بھی تو نصیب نہیں
جو بلّیوں اور کتوں کے سامنے پھینکے جاتے ہیں... آج ہم نے نئے کپڑے زیب تن نہیں کیے.. مگر
بہتوں کو جسم ڈھانکنے کے لیے وہ کپڑا بھی تو میسر نہیں جو ہمارے ٹخنوں سے نیچے لٹکنے والے
پائجامے کی زینت بنتا ہے.. اور کتنے شہیدانِ وفا کے لیے دو گز کفن بھی میسر نہیں... ہم تو ایئر کنڈیشنڈ
ٹرین کے اسپیشل ڈبوں میں نرم و گداز مسہریوں پر دراز تھے... اور کتنے بندگانِ خدا کے لیے تو تپتے
صحراؤں میں آگ اگلتے آسمان کے نیچے لُو کے گرم گرم تھپیڑوں میں ایک سائبان بھی نہیں... اور
ہاں آج ہم اک ایسے دیس میں عید منا رہے ہیں جہاں زبان کوئی نہیں جانتا.. مگر اشاروں کی تو ایک
زبان ہے، چناں چہ وہی استعمال کی جا رہی ہے.. مگر میرے وہ پیارے نبی کے دُلارے صحابہؓ اور
ان کے سچے جانشین کیسے پہنچے ہوں گے یہاں کے صحراؤں میں.. ایمان کا علم لے کر.. اور اس
ظلمت کدۂ دہر کو کیسے انھوں نے نکہت و نور کا مرقع بنایا ہوگا.. یقین کی قندیل لے کر.. وفا کی راہ میں
وہ سنہرے نقوش چھوڑ گئے کہ آنے والے اس کا تخیل بھی نہیں کر سکتے.. زبانِ بے زبانی کے ذریعے
انھوں نے ملکوں ملکوں کی خاک چھانی.. زبان بدلی.. زمان بدلے.. مکین بدلے.. مکان بدلے.. غرض
زمین و آسمان بدلے.. مگر آہ! میں نے کیا کیا؟! انھیں کا تو ایک جانشین میں بھی ہوں.. انھیں کا ایک
نام لیوا میں بھی ہوں۔ بہر حال آج اک عید ایسی بھی منائی میں نے۔

ہنزوا اسٹیشن پر

ہنزوا اسٹیشن پر ٹرین ۳۰-۱۰ کے قریب رکی، اور ہم لوگ پلیٹ فارم پر اترے، اب

یہاں سے یِؤ (Yiwu) جانا تھا اس لیے کہ احباب وہاں ہماری آمد کے منتظر تھے، کیوں کہ آج عید کا دن تھا، اور انھوں نے قربانی بھی کی تھی، اب اس انتظار میں تھے کہ ہمیں قربانی کا گوشت کھلائیں گے، اللہ اللہ کر کے یِؤ (Yiwu) تک جانے کا ٹکٹ ملا، جو بے پناہ ہجوم کی وجہ سے دشوار ترین معلوم ہو رہا تھا، بلیٹ ٹرین تو نہ مل سکی، البتہ لوکل ٹرین کا ٹکٹ ملا اور سہ پہر تین بجے کے قریب اس ٹرین سے ہم ہنزو سے نکلے، اور مغرب کے قریب یِؤ (Yiwu) پہنچ گئے، وہاں بھائی یاسر اور دیگر احباب نے دعوت کا اہتمام کیا تھا اور تمام بھٹکلی ساتھی جمع ہو گئے تھے۔ اگلے روز بھی اسی طرح دعوتیں ہوتی رہیں، جناب رفیع کولا صاحب اور ہمارے عزیز اور والد صاحب کے دوست قاضیا عبد الستار صاحب کے فرزند عفان نے بھی خوب مہمان نوازی کی، گوانزو سے مدثر محتشم بھی دیارِ غیر کی عید اور اس کی خوشیوں میں اہلِ وطن کا ساتھ دینے کے لیے حاضر ہوئے تھے، ان لوگوں سے ملاقاتیں خوب رہیں، شانگھائی سے فیض قاضیا ابن جناب مزمل صاحب قاضیا (یہ بھی ہمارے عزیز ہوتے ہیں، عارضی طور پر بنگلور سے ان کی کمپنی نے انھیں شانگھائی بھیجا تھا) آ گئے تھے اور ایک خوب صورت اجتماع ہو گیا اور ۵/ اکتوبر کا دن انھیں کی نذر ہو گیا اور وطن واپسی کی کچھ تیاریاں بھی کی گئیں۔

۶/ اکتوبر صبح ٹیکسی کرایہ پر لے کر ہم لوگ شانگھائی ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے اور ۲/ بجے کے قریب ہم Pudong کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر تھے۔ یہ دنیا کے انتہائی خوب صورت اور جدید ترین ہوائی اڈوں میں سے ایک ہے۔ ۵/ بجے کے قریب چین اور اہل چین کو الوداع کرتے ہوئے ایئر چائنا کے طیارے سے واپس ممبئی کے لیے روانہ ہوئے۔

الوداع اے چین

شانگھائی کے ایئرپورٹ سے جب رخصت ہو رہے تھے تو دل میں کچھ اس طرح کے خیالات موجزن تھے:

الوداع اے خاکِ چین! الوداع اے سرزمینِ چین! عنقریب پھر ملیں گے... تیری زندگی کے تجربات سے میں نے کافی کچھ سیکھا... تیرے پہلو میں کچھ ایام گذار کر کئی سبق حاصل

کیے... تیری فضاؤں میں کئی دن تک اڑتا رہا... تیرے جمالِ فطرت سے لطف اندوز ہوتا رہا... پھر میں نے یہ جانا کہ تیرے سپوتوں کے پاس بے شمار قابلِ قدر انسانی خصوصیات ہیں... مگر ابھی بہت کمی ہے... میرے پاس تجھے نوازنے کے لیے بہت کچھ ہے... کیوں کہ تیرے پاس ایمان کی روشنی نہیں ہے، جس سے وہ سب مسائل حل ہو سکتے ہیں جو ہزار انسانی نسخوں کے باوجود حل نہیں ہو پائے... ایمان تو میرے پاس ہے؛ مگر اس میں تیرا کیا قصور؟ قصور تو میرا ہے کہ میں نے تجھ تک وہ میراث پہنچانے میں کوتاہی کی جو کبھی تیرے دامن میں بھی میرے آباء نے پہنچائی تھی... کبھی تیری خاک پر ان کا ایمانی کارواں اترا تھا، کچھ کچھ تجھے بھی یاد ہے... میں نے ایمان کی دولت سے تجھے بہرہ ور کرنے کی وہ کوشش نہیں کی جو کرنی چاہیے تھی... میں نے تیرے باشندوں کے دلوں کو جیتنے کی جستجو نہیں کی... کیوں کہ میں خود آہِ سحر گاہی اور لذتِ راز و نیاز سے محروم ہوں... ابھی میرا جہانِ قلب ہی گماں آباد ہے... میرا چہرہ یقیں کے نور سے اور آنکھیں عشق کے سرور سے خالی ہیں... دل ویران ہے؛ کیوں کہ محبوبِ حقیقی کی محبت سے عاری ہے... اس نتیجے تک پہنچنے کے اور بھی اسباب ہو سکتے ہیں؛ مگر سب سے بڑا سبب میری کوتاہ نظری ہے، میری تہی دامانی ہے، میری دنیا طلبی ہے، میری عیش کوشی ہے، جفاکشی کی زندگی سے میری دوری ہے... میرے پاس فلسفہ رہ گیا؛ تلقینِ غزالی نہ رہی... میرے پاس آدابِ خود آگاہی نہ رہے... اوصافِ حجازی نہ رہے... میرے پاس درویشی نہ رہی... میری فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی نہ رہی... کچھ بھی ہو بہر حال آج میں وعدہ کرتا ہوں کہ تجھ سے باندھے گئے پیمانِ وفا کو نبھاؤں گا... تجھ تک اپنے رب کے پیامِ محبت و معرفت کو پہنچاؤں گا کہ تیرا نصیبہ جاگ جائے... تجھے حقیقی لذتیں نصیب ہوں... اور دنیا و آخرت کی سچی خوشیوں سے تیرا دامن بھر جائے۔

چین سے واپسی اور ممبئی سے بھٹکل تک

واپسی میں بھی چھینگ ڈو (Chengdu) کے راستے سے جہاز کو ممبئی پہنچنا تھا؛ چناں چہ چھینگ ڈو (Chengdu) پہنچ کر جہاز بدلا گیا اور ہم ممبئی کے جہاز پر سوار ہوئے، شانگھائی سے چھینگ ڈو (Chengdu) تین گھنٹے اور وہاں سے ممبئی پانچ گھنٹے اڑان بھرنے کے بعد

کافی خوش گوار تجربات کے ساتھ ہم واپس اپنے ملک کی سرزمین پر اتر چکے تھے، مگر ابھی ایک اور آزمائش سے گذرنا تھا، ممبئی پہنچ کر بھائی اطہر کی ہمشیر کے یہاں رکنا ہوا، بھائی سعد اللہ نے اب بھی مہمان نوازی کا حق ادا کیا، ہم کو لینے خود ہی ایئر پورٹ حاضر ہوئے، اور اپنے یہاں لے گئے، صبح ۹ بجے کے قریب پنویل سے بھٹکل کے لیے منگلا ٹرین پکڑنی تھی؛ اس لیے علی الصباح فجر کے معاً بعد پنویل کے لیے نکل گئے، جیسے ہی پنویل اسٹیشن پر اترے ایک بری خبر کانوں میں آئی کہ چپلون اور رتنا گیری کے بیچ میں کہیں مال بردار ٹرین پٹری سے اتر گئی ہے اور ایسی بری طرح کہ خود پٹریاں اکھڑ گئی ہیں جس کی وجہ سے ٹرینوں کی آمد ورفت متاثر ہوگئی ہے، اور اس کی مرمت میں چوبیس گھنٹے سے زائد لگ سکتے ہیں، اس خبر کا سننا تھا کہ ہمارے چہرے مرجھا گئے، مگر کیا کرتے! اب کوئی راستہ بھی نہیں تھا، پہلے معلوم ہوتا تو ممبئی ہی میں رکتے، اب انتظار اور تسلیم ورضا کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا، اس لیے آنے والے حالات سے نمٹنے کی ٹھان لی، اب تک ہماری ٹرین وقت پر تھی، لیکن یہاں باہر ہی اسے روک دیا گیا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد اسے اسٹیشن میں باریابی کی اجازت ملی، پھر جو تاخیر ہونی شروع ہوئی آگے چل کر وہ آٹھ گھنٹوں میں تبدیل ہوگئی، متضاد خبریں پھر بے چینی میں اضافہ کردیتیں، پہلے تو اس کا راستہ بدل کر براہِ پونہ وبلگام روانگی کی تجویز سامنے آئی پھر رائے بدلی گئی اور اسی راستے پر نکلنا طے پایا، البتہ چپلون سے رتنا گیری تک بس کی خدمات حاصل کرنے کا اشارہ ملا، خدا خدا کر کے کسی طرح پانچ بجے چپلون پہنچنا ہوا، ہمارے بعض اساتذہ نے چپلون کے بعض مخلصین کو اس کی اطلاع کردی تھی، جس کی وجہ سے آنے والے وقت میں کافی آسانی ہوئی، اور جامعہ کا تعلق خوب کام آیا۔

یہاں پہنچنے پر عجیب منظر دیکھنے کو ملا، ایک طرف بارش مسافروں کے لیے زحمت کا سبب بن رہی تھی تو دوسری طرف لال ڈبہ بسیں کھڑی تھیں، جن کو دیکھ کر ہی متلی اور قئے شروع ہوجائے، پھر اس پر مستزاد مسافروں کا ہجوم، ایک ایک بس میں ۷۰/ مسافروں کو بیٹھنا اور ۹۰/ کلومیٹر کا سفر کرنا تھا کہ ۲۵/ بسیں ہی اس کے لیے مخصوص تھیں۔

کتنا عجیب تجربہ تھا، جن لوگوں نے ابھی تک اپنی زندگی میں ایک بار بھی لال ڈبے کا منھ

نہیں دیکھا تھا، نرم ونازک مسہریوں پر ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں جن کی صبح اور شام گذری آج ان کو بھی قدرت نے اس تجربے پر مجبور کیا تھا، اور اس کی وجہ سے غریبوں کی بلبلاتی ہوئی صبحوں اور کراہتی ہوئی شاموں کا کچھ احساس آج ان کو بھی ہو رہا تھا۔ مگر جامعہ کا تعلق ہمیں کام آیا، اللہ کا بے انتہا فضل ہوا کہ جامعہ کے بعض فضلاء مولوی مزمل وغیرہ، اور ان کے محترم چچا خالد صاحب خود اسٹیشن پر ہم لوگوں کو لینے آئے، ان لوگوں کی وجہ سے اتنی سہولت ہوئی جس کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، ٹرین میں پتہ نہیں کتنے مال دار اور اونچے اونچے عہدے اور مناصب والے موجود رہے ہوں گے اور حسرت سے ہمیں وہ تک بھی رہے تھے، مگر یہ راحت صرف ہم کو حاصل ہوئی، ہم سمجھتے ہیں کہ یہ (دین اور اہل دین سے برائے نام ہی سہی) نسبت کا نتیجہ ہے، خدا کرے کہ یہ نسبت اور تعلق آخرت میں بھی کام دے کہ نجات پانے والوں میں ہمارا بھی نام آجائے۔

ان لوگوں نے پہلے تو یہاں کی بعض دینی سرگرمیوں سے واقف کرایا، علی پبلک اسکول بھی لے گئے، مولوی مزمل کے یہاں چائے اور ناشتہ بھی ہوا، ایک گھنٹے میں ان سب چیزوں سے فراغت ہوئی اور پھر ہم کو رخصت کرنے کے لیے یہ حضرات رتنا گیری تک آئے، قدرت کی باتیں بھی عجیب ہوتی ہیں، کتنی مرتبہ چپلون کے پروگرام بنے اور منسوخ ہوئے، اور آج خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ یہاں سے گذرنا ہوگا، یہاں قدرت کی طرف سے ہماری روزی مقدر تھی۔ جب تک رتنا گیری ریلوے اسٹیشن پہنچے تب تک کافی بسیں آچکی تھیں، ابھی کچھ آنی بھی تھیں، ایک گھنٹے کے اندر وہ بھی آگئیں اور امیر قافلہ کی طرف سے صدائے رحیل سنادی گئی۔

۱۸/ستمبر ۲۰۱۴ء کو شروع ہونے والا یہ سفر بالآخر ۸/ اکتوبر ۲۰۱۴ء کی صبح بھٹکل پہنچ کر ختم ہوا اور یہ داستان بھی ختم ہونے کو آئی۔ یار زندہ صحبت باقی۔ ان شاء اللہ اگلے سفر میں پھر ملیں گے تبت، کاشغر اور چین کے دیگر شہروں میں۔ تب تک کے لیے اجازت دیجیے، والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔